THE QURANIC DOCTRINE OF SIN.

من تصنیف

پادری ڈبلیو۔ آر۔ ڈبلیو۔ گارڈنر صاحب ایم۔ اے

Approved by A. C. L. S. M.

By kind permission of the C. L. S.

کرسچن لٹریچر سوسائٹی کی اجازت سے

پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی۔ انارکلی۔ لاہور

نے شائع کیا

(۱۰۰۰) ۱۹۳۴ بار اوّل

P. R. B. S. LAHORE.

گناہ کیا ہے؟
ازروئے قرآن

اوّل

مسئلہ گناہ کو ازروئے قرآن بیان کرتے وقت ہم اس امر کے ظاہر کرنے کی سعی نہ کریں گے کہ جن مختلف زمانوں میں قرآن کی اشاعت ہوئی اُن میں بتدریج اس مسئلہ نے کیا ترقی کی۔ اس مسئلہ کی ایسی ترقی و نشو و نما کا مطالعہ شاید ممکن ہو۔ اور اگر ممکن ہو تو تاریخی پہلو سے بہت دلچسپ ہوگا۔ خاص کر اس لحاظ سے کہ محمد صاحب کی اپنی زندگی و تجربے میں اس مسئلہ نے کیا حصّہ لیا؟ اور جو لوگ محمد صاحب کے مخالف تھے اُن کے ساتھ سلوک کرنے میں اس مسئلہ کا کیا اثر ہوا؟ لیکن جس نقطۂ خیال سے ہم اس مسئلہ پر غور کیا چاہتے ہیں اُس کے لحاظ سے ایسا مطالعہ چنداں وقعت نہیں رکھتا۔

ہم تو اس کا نہایت نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں نہ اس کی رفتار کا سلسلہ کہ کیسے وہ اس نتیجے تک پہنچا۔ اس لئے گناہ کے بارے میں جو مختلف آیات قرآن میں آئی ہیں اُن پر غور کریں گے بلا اس لحاظ کے کہ تاریخی طور پر وہ آیات کب نازل ہوئی تھیں۔ اور یہ دریافت کریں گے کہ بحیثیت مجموعی اُن آیات کا مطالعہ

کرنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ جب کبھی محمد صاحب نے گناہ کا ذکر کیا تو اُن کے دل میں اُس کا کیا تصور تھا۔

پس جب ہم نے یہ ظاہر کر دیا کہ ہمارے مطالعے کا خاص مقصد کیا ہے تو ہم پہلے اُن الفاظ پر نظر ڈالیں جو گناہ کے لئے آتے ہیں اور جن کے ذریعے محمد صاحب نے بدکرداری کو ظاہر کر دیا۔

گناہ۔ شرارت یا بدی کے لئے جو عام لفظ استعمال ہوا ہے وہ سَیِّئَۃ ہے جس کی جمع سیاٴت آئی ہے۔ اس لفظ کے معنی بالضرور اخلاقی بدی یا شرارت نہیں۔ اکثر یہ لفظ نقصان یا چوٹ کے معنی میں آیا ہے جو ایک شخص نے دوسرے کو پہنچایا ہو۔ مفصلہ ذیل مقامات سے یہ ظاہر ہے۔ "چنانچہ اُس کو خدا نے اُن کی شر سے بچا لیا" (سورہ مومن ۴۰ ۔ ۴۸)[1]۔ اس لفظ سے ایسی مصیبتیں بھی مراد ہو سکتی ہیں جو خدا کسی انسان کی آزمائش کی خاطر اُس پر وارد کرتا ہے۔ چنانچہ یہ لکھا ہے "اور ہم نے اُن کو گروہ گروہ کر کے ملک میں پراگندہ کر دیا۔ اُن میں سے بعض تو نیک تھے۔ اور بعض نیک نہیں تھے۔ اور ہم نے اُن کو سکھ اور دُکھ (السَّیِّئَات) سے آزمایا تا کہ یہ رجوع لائیں"[2] +

اس لفظ سے سزا بھی مراد ہوتی ہے جو خدا کسی آدمی کی تنبیہ کے لئے بھیجتا ہے۔ خواہ اس دنیا میں مصیبت و آفت ہو یا عاقبت میں

[1] مقابلہ کرو ۳۰ ۔ ۱۶۵ + ۴۷ ۔ ۳۵ + ۱۱ ۔ ۴۲ ۔ ۳۸
[2] سورہ اعراف ۷ ۔ ۱۶۷

دُکھ اور ابدی عذاب ہو۔ چنانچہ یہ لکھا ہے "اور جب لوگوں کو ہم رحمت چکھا دیتے ہیں تو وہ اُس سے خوش ہوتے ہیں۔ اور اگر اُن کے بدلے میں جو پہلے اپنے ہاتھوں کر چکے ہیں اُن پر وبال آ جائے تو بس وہ آس توڑ بیٹھتے ہیں"[1]۔ برعکس اس کے عاقبت کی سزا کے لئے بھی یہ لفظ آیا ہے کہ جو بدیاں اُنہوں نے کی ہیں وہ اُن کے سامنے آ کھڑی ہوں گی۔ "جیسے جیسے عمل یہ لوگ کرتے رہے اُن کی برائیاں اُن پر ظاہر ہو جائیں گی"[2]۔

اس لفظ میں جو خاص خیال مستتر ہے وہ دُکھ یا مصیبت ہے جو رفتار زمانہ میں کال۔ خشک سالی یا وبا یا شخصی دشمنوں کے وسیلے یا براہ راست خدا کی طرف سے آزمانے یا سزا دینے کی خاطر وارد ہوں۔ اور اس تصور کے ساتھ یہ خیال بھی ملحق ہے کہ آدمی کی امیدیں اور توقع پوری نہیں ہوئیں۔ اُسے بھلائی کی امید اور انتظار تھی لیکن دیکھو بدی حاصل ہوئی۔

فعل سَآءَ کا استعمال بھی ایسا ہی ہے۔ اس سے آدمیوں کی ایسی بدی اور احمق پن ظاہر ہوتا ہے جس کے ذریعے اُن کی بھلائی نہیں بلکہ بُرائی ہوتی ہے[3]۔ یا اُن کی رائے اور عقل کی نادانی مراد ہے جب وہ کوئی غلط نتیجہ نکالتے ہیں۔ چنانچہ یہ جملہ آتا

[1] سورہ روم ۳۰ ۔ ۳۵ + مقابلہ کرو ۳ ۔ ۱۱۶ + ۴ ۔ ۸۱ + ۷ ۔ ۹۷ و ۹۳ + ۹ ۔ ۱۳ + ۷ ۔ ۲۷ + ۴۴ ۔ ۴۸ ۔ ۴۴ وغیرہ
[2] سورۂ جاثیہ ۴۵ ۔ ۳۳ + مقابلہ کرو ۱۰ ۔ ۲۸ + ۱۶ ۔ ۳۴ + ۴۰ ۔ ۹ سے
[3] سورہ ۹ ۔ ۷۰ + ۹ ۔ ۹

ہے" اور اُن میں سے اکثر تو بُرا کر رہے ہیں"[1]

لفظ السّیئات اخلاقی بدی کے ظاہر کرنے کے لئے کبھی آیا ہے۔ جس کی وجہ سے دُکھ، مصیبت یا سزا نازل ہوتی ہے۔ ایسے جملے ہیں[2] "اور جیسے جیسے عمل کرتے رہے ہیں اُن کی خرابیاں اُن پر ظاہر ہو جائیں گی" طبعی بدی سے اخلاقی بدی کے معنی کی طرف رجوع کرنے کا زمانہ پایا جاتا ہے۔ پھر بھی لفظ کے اصلی معنی ایسے جملوں میں لگے رہتے ہیں "واقعی بات تو یہ ہے کہ جس نے سیئے باندھی رکمائی (بُرائی) اور اپنے گناہ کے پھیر میں آگیا۔ تو ایسے ہی لوگ دوزخی ہیں"[3] یا "جن لوگوں نے بُرے کام کئے (کمائے)، تو بُرائی کا بدلہ ویسی ہی" (بُرائی)[4]۔ لفظ کے معنی کی یہ تبدیلی اُس وقت مکمل ہوگئی جب کَسَبَ کی جگہ (کمایا) لفظ عَمَلَ (کیا) استعمال ہونے لگا۔ "جو بُرے کام کرتا ہے تو اُس کو ویسا ہی بدلہ ملے گا"[5] "اللہ اُن لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں کرتا جو (عمر بھر) بُرے کام کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے جب کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو تو لگے کہنے کہ اب میری توبہ"[6] یا یہ "اور جو لوگ گناہوں کے مرتکب ہوئے پھر اس کے بعد توبہ کی اور ایمان لائے"[7]

[1] [illegible] ۳۷ [2] سورہ زمر ۳۹-۴۹
[3] سورہ بقرہ [illegible] [4] سورہ یونس ۱۰-۲۸ [5] سورہ مومن ۴۰-۴۰
[6] سورہ نساء ۴-۲۲ [7] سورۃ الاعراف ۷-۱۵۲

مگر آخر تک یہ خیال باقی رہتا ہے کہ جو فعل لفظ السّیئات سے ظاہر کیا جاتا ہے گو وُہ اخلاقی طور پر بد ہو لیکن بدانہ اس لفظ میں ایسی بدی کا ذکر ہے جس کے ذریعہ وُہ اپنے تئیں نقصان پہنچاتا یا اپنے مفاد کے خلاف عمل کرتا ہے۔ بہ نسبت اس بدی کے جو الٰہی شریعت کی خلاف ورزی یا خدا کے احکام و مرضی کے خلاف ہے اس لئے یہ جملہ آیا "جو لوگ ان سے پہلے ہو گزرے ہیں اُنہوں نے بھی ایسا ہی کیا اور خدا نے اُن پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وُہ اپنے اُوپر آپ ظلم کرتے رہے۔ انجام یہ ہوا کہ اُن کے عملوں کے بُرے نتیجے اُن کو ملے"[1]۔

ان بدکاموں (السّیئات) کے بالمقابل نیک کام (الحسنات) ہیں اور محمد صاحب نے یہ مانا کہ نیک کاموں کی عادت اور دل و عقل کی کیفیت جو ان نیک اعمال کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہے ایسی طاقت ہے جس سے گناہ کی آزمائش پر غالب آنے میں ایماندار کو مدد ملتی ہے۔ دینداری کی دعا اور دعا کی روح کے ذریعے ارادے میں جو استقلال پیدا ہو جاتا ہے اُس سے اس کی تشریح ہوتی ہے۔ "دن کے دونوں سرے اور اوائل شب [illegible] نماز پڑھا کرو کیونکہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں"[2]۔ یہ تصور کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں کچھ بدل کر یہ مسئلہ بن گیا کہ نیکیوں کے

[1] سورہ نحل ۱۶-۳۵ و ۳۶ [2] سورہ ہود ۱۱-۱۱۶

ذریعہ ایماندار کو گناہوں کی معافی حاصل ہو جاتی ہے۔

بعض مقامات میں یہ امتیاز بھی کیا گیا ہے کہ بعض بدیاں جو السّیئات کہلاتی ہیں اُن کبیرہ گناہوں سے متفرق ہیں جن سے توبہ کرنا لازمی ہے ورنہ خدا اُن کو معاف نہ کرے گا۔ چنانچہ یہ لکھا ہے "جن سے تم کو منع کیا جاتا ہے اگر تم اُن میں سے بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم تمہارے (چھوٹے چھوٹے) قصور (سیّئات) محو کر دیں گے" (سورہ نساء ۴-۳۵ + نیز دیکھو ۲۵-۲۰ + ۴۶-۱۵ + ۲-۲۷۳)۔

گناہ کے لئے جو دوسرا لفظ آیا ہے وہ ذنب ہے۔ لغت کے لحاظ سے اس لفظ کے یہ معنی ہیں کہ کسی کو پیٹھ پیچھے سے آن کر نقصان پہنچائیں یا اُس پر حملہ کریں۔ بعد ازاں اس کے معنی عام ہو گئے۔ اگر ہمارے کسی فعل سے کسی کو ایسا نقصان پہنچے تو یہ قصور ذنب کہلایا۔ البتہ اس کا ذکر قرآن میں پایا نہیں جاتا کہ کیسے یہ لفظ اپنے لغوی معنی سے گزر کر اس عام معنی میں مستعمل ہونے لگا۔ محمد صاحب نے اس لفظ کو محض جرم یا گناہ کے معنی میں لیا۔ اگرچہ یہ لفظ خاص اور بہت افعال پر حاوی ہو تو بھی اس میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اس فعل میں اخلاقی گناہ تھا۔ عام معنی کی یہ مثال ہے "اپنے بندوں کے گناہوں سے اُس (خدا) کا باخبر ہونا بس کرتا ہے" (سورہ فرقان ۲۵-۶۰ + مقابلہ کرو سورہ ۱۷-۱۸

ہے)۔ نیز دیکھو "اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ کیونکہ اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے"۔

ذنب میں ایسے اخلاقی قصور داخل ہیں جن میں انسان اپنے ادائے فرض میں قاصر رہا۔ گو وہ کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو تو بھی وہ قابل جرم ہیں۔ مثلاً یہ لفظ اس آیت میں اس معنی میں آیا۔ "صبر کر بے شک خدا کا وعدہ برحق ہے۔ اور اپنے گناہوں (ذنبک) کی معافی مانگتا رہ" (سورہ المومن ۴۰-۵۷)۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسروں نے یہ لکھا کہ جن گناہوں کا یہاں ذکر ہے وہ یہ ہے کہ کافروں کے ڈر سے حقیقی دین کے پھیلانے میں مخالفت یا سستی کرنا۔ اس لفظ کے معنی میں یہ وسعت آ گئی۔ الغرض جو فعل ذنب کہلاتا ہے وہ اخلاقی بدی ہے۔

خدا کے مکاشفے پر ایمان نہ لا کر جن لوگوں نے بے دینی ظاہر کی۔ یا خدا نے جو تقاضا کیا تھا کہ اُس کی عبادت اور طاعت کی جائے جن لوگوں نے اُس کو حقیر جانا۔ یا جنہوں نے اُس کے رسولوں کی تعلیم کا انکار کیا۔ ایسے سارے افعال کے لئے لفظ ذنب استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "تو ہم نے اُن سب کو اُن کے گناہ (ذنب) میں دھر پکڑا" (سورہ عنکبوت ۲۹-۳۹ + نیز مقابلہ کرو فرعون، ہامان اور قارون وغیرہ سے)۔ "اُن کے پروردگار نے اُن کے گناہ کے بدلے (ذنب) اُن پر آفت نازل کی" (سورہ شمس ۹۱-

۱۴+ مقابلہ ہود ۳-۹+ ۶-۶+ ... ۸۰-۵۴ ... ۵۶ ... ۴۰-۲۲) +

یہ لفظ سارے مخرب اخلاق افعال پر مشتمل ہے۔ یعنی جو فعل خدا کے مقرر کردہ قانون یا انتظام کے خلاف ہو۔ خواہ اُس کی نسبت صریح حکم ملا ہو۔ یا طبعی شریعت کے وسیلے انسان کے دل (ضمیر) پر ثبت ہو۔ چنانچہ یہ آیا ہے "جب کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھتے ہیں یا اپنا نقصان کر لیتے ہیں۔ تو خدا کو یاد کر کے اپنے گناہوں (ذنوب) کی معافی مانگنے لگتے ہیں" (سورہ آل عمران ۳-۱۲۹) یا "تو اپنے گناہ کی (ذنب) معافی مانگ" (سورہ یوسف ۱۲-۲۹ دیکھو فوطیفار کی بیوی)۔ "اور میرے ذمّے قبطیوں کا ایک (ذنب) جرم بھی ہے" (سورہ شعرا ۲۶-۱۳ + موسیٰ کے خلاف قتل کا گناہ)۔ نیز مقابلہ کرو ۸۱-۹۰ +

عام معنی میں یہ لفظ سارے قصوروں۔ جرموں اور گناہوں پر حاوی ہے۔ خواہ وہ مجرمانہ غفلت کا نتیجہ ہوں یا غرور۔ گستاخی اور کجروی کا جیسا کہ خدا سے غافل رہنے اور ایسی زندگی دنیوی زندگی بسر کرتے ہیں جس میں خدا اور اُس کے احکام کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا۔ محمد صاحب کے گناہوں کے لئے بھی یہی لفظ استعمال ہوا کہ "خدا نے تیرے اگلے اور پچھلے گناہ بخشش دیئے" (سورہ فتح ۴۸-۲) یا "بخشش" مفصلہ ذیل آیات میں بھی یہ لفظ اسی وسیع معنی میں مستعمل ہوا ہے "اپنے گناہوں (ذنب) کی معافی مانگتا رہ اور

ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کے لئے" (سورہ محمد ۴۷-۲۱) + "ہم اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں" (سورہ مومن ۴۰-۱۱ نیز ۶۷-۱۱+۴۶-۳+ ۷۱-۴ + ۳-۲۹ + ایماندار یوم الحساب کو یہ اقرار کرتے ہیں) +

الغرض ہر طرح کی بے ایمانی اور بے ایمانی کے سارے کاموں کے لئے یہ لفظ ذنب آیا ہے۔

تیسرا لفظ جو گناہ کے لئے آتا ہے وہ خطا ہے یا جو لفظ اُس سے مشتق ہیں۔ اس لفظ کے ماخذ کے معنی ہیں نشانہ خطا کرنا یعنی کسی شئے کو نشانہ بنانا۔ لیکن ٹھیک نشانہ تک نہ پہنچنا۔ یہ لفظ ایسے ناروا فعل کے لئے بھی آتا ہے جو سہواً کسی سے سرزد ہو۔ مثلاً یہ لکھا ہے "کسی مسلمان کو روا نہیں کہ مسلمان کو مار ڈالے مگر غلطی سے (خطاءً)" (سورہ نسا ۴-۹۴)۔ الغرض اس میں وہ سارے ناروا افعال داخل ہیں جن کا ارتکاب نیک نیتی سے نادانستہ ہوا ہو۔ اس کا یہ استعمال بھی ہے۔ "تم سے اس میں بھول چوک ہو جائے تو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں۔ مگر ہاں دل سے ارادہ کر کے ایسا کرو" (تو البتہ گناہ کی بات ہے) (سورہ احزاب ۳۳-۵) + اس فعل میں جرم یہ ہے کہ اگر یہ ناروا فعل دانستہ عمداً کیا جائے۔ پس اس لفظ سے ایسا ناروا فعل بھی مراد ہے جو نادانستہ یا غفلت سے سرزد ہو۔ "اے ہمارے پروردگار اگر

ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو ہم کو نہ پکڑ" (سورہ بقرہ ۲-۲۸۶)۔

عام طور پر یہ تصور مروج ہے کہ بد اعمال بے ایمانی سے صادر ہوتے ہیں۔ اس کا کچھ مضائقہ نہیں کہ وہ بے ایمانی نادانی سے تھی یا بلا نادانی۔ چنانچہ ایمان لانے سے پہلے ابراہیم کی بت پرستی کے لئے یہ لفظ آیا ہے (سورہ ۲۶-۸۲ + بمقابلہ ۲-۷۵) اور فرعون کے جادوگروں کے گناہ کے لئے بھی جنہوں نے جان بوجھ کر گناہ کیا (سورہ ۲۶-۵۱ و ۲۰-۷۵)۔

مگر جرم یا گناہ کا تصور بہت آسانی سے اس لفظ میں آگیا اور اس لئے یہ لفظ تقریباً انہی معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے جن میں کہ لفظ ذنب ہوتا ہے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل ۱۷-۳۳ میں آیا ہے۔ "افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ اُن کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مارنا بڑا بھاری (خطاءً کبیراً) گناہ ہے"۔

جرم ذنب کے ارتکاب سے آدمی گنہگار (خاطی) ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یعقوب کے بیٹوں نے یوں کہا "ابا جان ہمارے گناہ (ذنوب) معاف کرائیے بے شک ہم ہی گناہ گار (خاطئین) ہیں" (سورہ یوسف ۱۲-۹۸) اور فوطیفار نے کہا "اے یوسف اس (بات) کو جانے دو۔ اور (اے عورت) تو اپنے قصور (ذنب) کی معافی مانگ کیونکہ سراسر تیری ہی خطا (خاطئین) تھی" (سورہ یوسف ۱۲-۲۹)۔

پس یہ لفظ خاطیات گناہ کے لئے عام لفظ ہو گیا اور خاطی گنہگار کے لئے۔ اور دونوں الفاظ کا بلا امتیاز استعمال ہوا خواہ وہ ناروا فعل سیئات ہو یا ذنب۔ ہر خاطی کے لئے یہ ضرور نہیں کہ جو فعل بد (سیئات) کا مرتکب ہو یا ذنب کا یا بُرا کام (سیئات) کیا ہو وہ گنہگار (خاطی) ہے۔

ایک اور لفظ گناہ کے لئے اثم بمعنی قصور۔ بے انصافی یا جرم آتا ہے اس لفظ میں ابتدائی خیال غفلت تھا خاص کر گفتار میں۔ اور قطع وضع میں۔ اس لئے سست رفتار لنگڑاتے تھکے ماندے اونٹ کے لئے لفظ آثیم مستعمل ہوا۔ (عبرانی ڈکشنری گیسے نی اس صاحب کی)۔

عربی لفظ کے بھی تقریباً وہی معنی ہیں جو عبرانی لفظ کے ہیں (آثم) یعنی ادائے فرض میں قاصر رہنا۔ اور اس لئے مجرم ہو جانا۔

اس لفظ کے مختلف معنی قرآن میں صاف طور سے آئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ سلوک کرنے میں قصور یا جرم خواہ کوئی فعل شنیع سرزد ہوا ہو۔ دوسروں کی نسبت بلا وجہ شک رکھنا یا دوسروں کی شان میں ناشائستہ خیال رکھنا۔ چنانچہ یہ آیا ہے "مسلمانو۔ (لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے سے بچے رہو۔ کیونکہ بعض شک گناہ (اثم) ہیں"۔ (سورہ حجرات

۹۴-۱۲)۔ مگر اس قسم کا قصور یا خطا آدمی پر یہ الزام لے آتی ہے
کہ جس کی نسبت اُس کو شک تھا اُس نے اُس سے بدی کی۔
پس اگر کسی معصوم شخص کے خلاف بدی کا بے بنیاد الزام لگائے
تو اُس کے لئے بھی یہی لفظ آیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ کے خلاف
الزام کے لئے یہی لفظ مستعمل ہوا "طوفان اُٹھانے والوں میں
سے جتنا گناہ (اثم) جس نے سمیٹا (اُس کی سزا) بھگتے گا" (سورہ
نور ۲۴-۱۱) اور پھر یہ "اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کو بدل کر اُس
کی جگہ دوسری بیوی کرنے کا ہو۔ تو گو تم نے پہلی بیوی کو ڈھیر
سارا مال دے دیا ہو۔ تاہم اُس میں سے کچھ بھی (واپس) نہ لینا"
کیا کسی قسم کا بہتان لگا کر اور صریح بے جا (اثم) بات کر کے اپنا
دیا ہوا اُس سے واپس لیتے ہو" (سورہ نسا ۴-۲۴) +

ایک دوسرے سے بدظنی یا بدخواہی اور یہ خیال خواہ ظاہر
میں یا باطن میں کہ اُنہوں نے ناحق کیا ہے اس امر کے لئے
آمادہ کرتا ہے کہ اُس ساری بدی کا بدلہ دیا جائے۔ خاص کر
جب یہ خیال ہو کہ وہ بدی خود اُس کے ساتھ ہوئی یا اُس کے
حقوق تلف ہوئے۔ ایسی بدظنی سے کہ فلاں کس نے
مجھے نقصان پہنچایا یا مجھ سے بدی کی حالانکہ اُس نے ایسا
نہیں کیا ہو انتقام یا بدلہ لیا جاتا ہے وہ بھی اثم کہلاتا ہے چنانچہ
یہ لکھا ہے "نیکی اور پرہیزگاری (کے کاموں) میں ایک دوسرے

کے مددگار ہو جایا کرو۔ اور گناہ (اثم) اور زیادتی کے کاموں میں
ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو" (سورہ مائدہ ۵-۳)۔ اور پھر یہ
"وہی تم ہو کہ اپنوں کو مارتے۔ اور نیز اپنوں میں سے کچھ لوگوں
کے مقابلے میں ناحق (اثم) اور زبردستی سے ایک دوسرے کے
مددگار بن کے اُن کو اُن کے شہروں سے دیس نکالا دیتے
ہو" (سورہ بقر ۲-۷۹) +

یہ ممکن ہے کہ آدمی کسی سے زیادتی کرے یا اُسے نقصان
پہنچائے لیکن انتقام کی راہ سے نہیں بلکہ کسی دیگر غرض سے۔
اس لئے اس وسیع معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوا کہ کسی نے
کسی سے بے انصافی یا بدی کی اور ایسے فعل میں جو بدی
تھی اس کا اظہار (اسی لفظ کے ذریعے سے کیا گیا)۔ اس کی
مثال سورہ نسا ۴-۱۱۲ میں پائی جاتی ہے "جو شخص کسی خطا یا گناہ (اثم)
کا مرتکب ہو۔ پھر وہ اپنے قصور کو کسی بے گناہ پر تھوپ دے تو
اُس نے بہتان اور گناہ صریح (اثماً) کا بوجھ اپنی گردن پر (اُٹھا)
لیا" اور جو لوگ مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بغیر اس
کے کہ اُنہوں نے قصور کیا ہو (ناحق کی تہمت لگا کر) ایذا دیتے
ہیں تو وہ جھوٹ (طوفان) اور صریح گناہ (اثماً) کا بوجھ (اپنی
گردن پر) لیتے ہیں" (سورہ احزاب ۳۳-۵۸)۔
اب یہ ظاہر ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں آنے لگا۔ کہ کسی نے

کسی دوسرے سے بے انصافی کی یا اُس کو نقصان پہنچایا - اور ایک قدم آگے بڑھ کر یہ معنی ہوئے - ایسا ناروا فعل جس سے آدمی کو خود نقصان پہنچے - چنانچہ اس معنی میں یہ لفظ سورہ نساء ۴- ۱۱۱ اور سورہ بقرہ ۲- ۲۱۶ میں مستعمل ہوا - "جو شخص کسی بدی (اثماً) کا ارتکاب کرتا ہے تو وُہ اُس کے ارتکاب سے اپنی ہی خرابی کرتا ہے۔" "تجھ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو کہدے کہ دونوں میں بڑا گناہ (اثمٌ) ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں مگر اُن کے فائدے سے اُن کا گناہ (اثمھما) بڑھ کر ہے۔"

اس لفظ نے ایک دوسری سمت میں بھی ترقی کی - یہ لفظ اس امر کو ظاہر کرنے کے لئے مستعمل ہوا کہ خدا کی طرف غلط روش اختیار کی گئی جیسے پہلے ہمسائے کے خلاف روش اختیار کرنے کو یہ لفظ آیا تھا - مثلاً دیکھو سورہ نساء ۴- ۵۱ کو "اللہ تو اس کو معاف کرنے والا ہی نہیں کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک گردانا جائے - ہاں اس کے سوا جو گناہ جس کو چاہے معاف کر دے - اور جس نے (کسی کو) خدا کا شریک گردانا تو اُس نے (خدا پر طوفان) باندھا جو بہت ہی بڑا گناہ (اثماً) ہے۔" خدا کے حق کے خلاف جو فعل ہو اُس کے لئے بھی یہ لفظ آیا جس سے اُس کے معنی یہ ہوئے تجاوز کرنا - خدا کے نواہی کا مجرم

ہونا یا جیسا خدا نے حکم دیا تھا ... یا ذکر نہ کرنا (؟) گنتی کے ان چند (ا) دنوں میں خدا کی یاد کرتے رہو - پھر جو شخص جلدی کرے اور (دو ہی دن میں) چل کھڑا ہو اُس پر بھی کچھ گناہ (اثم) نہیں اور جو دیر تک ٹھیرا رہے اُس پر بھی کچھ گناہ (اثم) نہیں - یہ (رعایت) اُن کے لئے ہے جو پرہیزگاری کریں" (سورہ بقرہ ۲- ۱۹۹) - ممنوع اشیا کے کھانے کے گناہ کے لئے بھی یہ لفظ آیا - "ان میں سے بہتیروں کو دیکھو گے کہ گناہ (اثم) کی بات (یعنی جھوٹ) اور (مال) حرام کے کھانے پر گرے پڑتے ہیں" (سورہ مائدہ ۵- ۶۷)

مگر یہ قابل لحاظ ہے کہ محض کھانے میں جرم نہیں - لیکن فعل کی بُرائی نیت پر موقوف ہے - چنانچہ یہ لکھا ہے "پھر جو بھوک سے بے قرار ہو اور گناہ (اثم) کی طرف اُس کا میلان نہ ہو اور وُہ مجبوری کوئی حرام چیز کھائے تو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے" (سورہ مائدہ ۵- ۵) - پھر ایک دوسری سورہ میں یہ الفاظ آئے "تو جو بھوک سے بے قرار ہو جائے اور عدول حکمی کرنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو تو اُس پر گناہ (اثم) نہیں بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے" (سورہ بقرہ ۲- ۱۶۸)

اب ایک اور قدم آگے بڑھایا گیا جب کہ دیکھو ہاں "اور لوگو ظاہری گناہ (اثم) اور پوشیدہ گناہ سے کنارہ کش رہو کیونکہ جو لوگ گناہ (اثم) سمیٹتے ہیں اُن کو اپنی کرتوت کا جلد بدلہ مل جائے گا"

(سورہ انعام ۶-۱۲۰)۔

الغرض یہ لفظ اِثم ہر بدی یا جرم یا قصور کے لئے مستعمل ہوتا رہا ہے۔ ہابیل نے یہ کہا "میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا گناہ سمیٹے" (سورہ مائدہ ۵-۳۲)۔

اسی لفظ کے استعمال کے قرینے میں کبیرہ اور صغیرہ گناہوں میں امتیاز کیا گیا ہے۔ دیکھو سورہ نجم ۵۳-۳۳) "جو بڑے بڑے گناہوں (کبائر الاثم) اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے رہتے ہیں۔ مگر چھوٹے چھوٹے گناہ (اللمم) بے شک تمہارے پروردگار کی مغفرت وسیع ہے"

دوم

اس مطالعے کے سلسلے میں کہ گناہ اور بدی کو ظاہر کرنے کے لئے قرآن میں کونسے الفاظ استعمال میں آتے ہیں ہم لفظ اعتدا (بمعنی حد سے تجاوز کرنا) لیں گے۔ یہ لفظ قرآن میں حد سے تجاوز کرنے کے معنی ہی میں آیا ہے۔ کسی مقررہ حد سے آگے بڑھ جانے کو اعتدا کہتے ہیں۔ اکثر مثالوں میں یہ حد کسی حکم یا الٰہی رسم میں پائی جاتی ہے جس کے ذریعے انسان کے کاموں پر حد لگائی گئیں یا اعتدا انسان کے خلاف ہو سکتا ہے۔ "ادب والے مہینوں کا معاوضہ ادب والے مہینے ... تو جو تم پر زیادتی

کرے (اعتدی) تو جیسی زیادتی (اعتدو) اس نے تم پر کی ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کرو" (سورہ بقر ۲-۱۹۴) جس فعل کے لئے لفظ اعتدا آیا اس میں بذات خود شاید کوئی گناہ یا بدی نہ ہو کیونکہ ایسی حالتوں میں ان کو حد سے تجاوز کرنے کی اجازت ہے۔ اپنے ہم جنس کے معاملے میں حد سے تجاوز کرنے میں محض مخاصمانہ فعل کی طرف اشارہ ہے۔ وہ فعل آیت مذکورہ بالا کے مطابق شاید بے انصافی پر مبنی ہو اور اس لئے وہ بد سمجھا جائے یا انتقامی ہو اس لئے جائز اور راست سمجھا جائے۔

اس لئے یہ لفظ بذات خود کسی اخلاقی بدی یا نیکی سے فعل پر دال نہیں۔ صرف اس میں یہ اظہار ہے کہ فلاں فلاں کے درمیان جو عہد تھا اس کے خلاف کیا گیا۔ یا خدا اور انسان کے درمیان جو رشتہ ہے اس کے خلاف جس رشتے کا فیصلہ خدا کے حکم نے کر دیا۔ اس کی پروا نہیں کہ آیا وہ حکم اخلاق سے علاقہ رکھتا تھا یا رسمیات سے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا تعلق اخلاق سے ہو یا رسمیات سے۔

اب لفظ جناح کو لیں۔ اس لفظ کے یہ معنی ہیں صحیح روش و رفتار سے بھٹک جانا۔ خواہ یہ عورتوں کے سامنے کھانا کھانے سے علاقہ رکھتا ہو یا علیحدہ کھانے سے یا دیگر معاملات میں شائستگی وحیا سے اس کا تعلق ہو (سورہ نور ۲۴-۶۰)

"بڑی بوڑھی عورتیں جن کو نکاح کی امید باقی نہیں اگر اپنے کپڑے اتار رکھا کریں تو اس میں اُن پر کچھ گناہ (جناح) نہیں - بشرطیکہ اُن کو بناؤ دکھا منظور نہ ہو" (سورہ نور ۲۴-۶۰ ۵۹+۳۲- ۵+۵۴-۲۴ - ۵۷ +۴۴-۲۸) دیگر امور میں اس لفظ کا استعمال ویسا ہی ہے جیسا کہ لفظ اعتدیٰ کا تھا - یعنی راہ راست سے بھٹک کر دوسروں کے حقوق میں دخل دینا (سورہ ۲- ۲۲۹ وغیرہ) - لفظ اعتدیٰ انسان انسان کے درمیان رشتے یا خدا و انسان کے درمیان رشتے سے علاقہ رکھتا ہے ویسا ہی لفظ جناح - (سورہ ۲-۲۵ ۱۹۴ و ۲ ۱۵ + ۴-۲ - ۱۰۲ و ۱۰۳ + ۳۳-۵ و ۱۵ ۵+ ۲- ۲۸۲+۳-۲۸ و ۱۲۷ + ۶۰-۱۰) +

ذرا سے متفرق معنی میں یہ لفظ سورہ مائدہ ۵-۹۴ میں مستعمل ہوا ہے - "جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے تو جو کچھ (مناہی سے پہلے) کھا پی چکے اُس میں اُن پر گناہ (جناح) نہیں" +

اب ہم لفظ حرّم پر غور کریں - اِس کے معنی منع کرنا ہے اور جو لفظ اُس سے مشتق ہیں اُن کے بھی یہی معنی ہیں - لیکن ہم صرف سرسری نظر ڈالیں گے - ہمارے مقصد کے لئے اس لفظ کے لغوی معنی پر زور دینا ضرور نہیں - یہ ہمیں اُس کی طرف لے جاتا ہے جب تو عرب کے آبا و اجداد پر حکمران

تھا اس وقت ہمارے لئے زیادہ دلچسپی اس میں ہے کہ لفظ حرّم - حرام وغیرہ کے استعمال میں اُس معنی سے جو تبو سے علاقہ رکھتے تھے کچھ تبدیلی واقع ہوئی ہے - ان الفاظ میں اس شے کی طرف اشارہ ہے جو مقدس ہونے کی وجہ سے ممنوع تھی کیونکہ شروع میں اخلاقی طبقے میں کچھ امتیاز نہ تھا - سب کچھ محض تبو تھا - مثلاً فلاں فلاں کھانے حرام تھے اور فلاں فلاں مقامات حرام تھے - اول الذکر اشیا اس لئے حرام سمجھی گئیں کیونکہ وہ بد تھیں اور موخرالذکر اس لئے حرام سمجھی گئیں کیونکہ وہ مقدس تھیں

اِس لئے یہ دریافت کرنے کا چنداں فائدہ نہیں کہ لغوی طور پر قرآن میں ان لفظوں کے کیا معنی آتے ہیں - ایسی تحقیقات کے ذریعے سے ہم اتنا معلوم کر سکتے ہیں کہ فلاں فلاں افعال یا مقامات پر کیسے یہ لفظ عائد ہوا - لیکن اس سے اس مسئلہ پر کچھ روشنی نہ پڑے گی کہ محمد صاحب اور اُس کے ہم عصروں نے اُن چیزوں کو کیا سمجھا جن پر یہ لفظ آیا تھا یا جب اُن کو استعمال کیا تو ٹھیک اُنہوں نے اُن کا کیا مطلب سمجھا -

اس لئے شاید یہ بہتر ہوگا کہ ان الفاظ کے لغوی معنوں کو ہم نظر انداز کر دیں اور صرف یہ کہیں کہ ان الفاظ کا دو طرح سے استعمال ہوا ہے - مثلاً یہ لکھا ہے - "مجھ کو بس یہی حکم ملا ہے کہ اس شہر کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو عزت (حرمت) دی ہے"

(سورہ نمل ۲۷-۹۱)۔ یہ شہر جس کو یہ عزت دی گئی پاک یا مقدس
شہر ہو گیا۔ (سورہ قصص ۲۸-۵۷)۔ اور جن مہینوں میں حج کیا جاتا
ہے وہ بھی مقدس مہینے ہو گئے (سورہ توبہ ۹-۳۶)۔ اور جب لوگ
ان مقدس مہینوں میں اس علاقے میں ہوں وہ بھی حُرُم کہلاتے
حرم اور اُس سے مشتق الفاظ کے ان لغوی معنوں سے اب ہم کو
چنداں سروکار نہیں سوائے اس کے کہ ان کے ذریعہ اُس کے
دوسرے پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

اس دوسرے پہلو کے لحاظ سے اس لفظ سے مراد چند
ممنوع افعال ہیں خواہ وہ ممانعت عارضی ہو یا مطلق۔ یہ ظن
غالب ہے کہ شروع میں عارضی ممانعت کا خیال ہو۔ کیونکہ اس کا
تعلق مقدس شہر اور مقدس رسوم سے تھا۔ اُس مقدس شہر اور علاقہ
میں یا مقدس مہینوں میں فلاں فلاں افعال حرام تھے (حُرُم)۔
"اور جنگل کا شکار جب تک احرام میں رہو تم پر حرام ہے" (سورہ مائدہ
۵-۹۶ و ۹۷)۔ ایسا فعل دوسرے موقعوں پر اور دوسرے اوقات
میں حلال تھا لیکن ان موقعوں اور ان موسموں میں حرام تھا (سورہ
توبہ ۹-۵)+

ممانعت کا یہ تصور دوسرے افعال تک پہنچ جاتا ہے اور یہ حکم
دائمی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ ۲-۱۶۹ + ۵-۴ + ۶-۱۴۶ + ۱۶-
۱۱۶ سے یہ ظاہر ہے کہ جس مرے ہوئے جانور اور خون اور سور کا گوشت

حرام کیا۔ اور وہ جانور جس کو خدا کے کسی اور کے لئے نامزد کیا
جائے"۔ خاص رشتوں میں شادی کی ممانعت کے لئے بھی لفظ
حرام آیا ہے (سورہ نسا ۴-۲۷ + نور ۲۴-۳)+

اس لفظ حرام اور اُس سے جو الفاظ مشتق ہیں اُن کے معنی
کے ان استعمالوں کے سوا بہت آیات میں یہ لفظ محض ممانعت کے
لئے آیا ہے بلا لحاظ اس امر کے کہ شئے ممنوع پاک یا ناپاک تھی۔
یہ استعمال اس طرح سے ہے۔ بنی اسرائیل کو موعود زمین میں چالیس
برس تک داخل ہونے کی ممانعت ہوئی۔ کیونکہ خدا نے فرمایا۔
"اچھا تو وہ ملک چالیس برس تک اُن کو نصیب نہ ہوگا" (مُحَرَّمَةٌ)۔
(سورہ مائدہ ۵-۲۹)۔ اور اس آیت میں بھی پاک و ناپاک کا امتیاز
پایا نہیں جاتا "ہم نے موسیٰ پر پہلے ہی سے (اناؤں کے) دودھ بند
کر رکھے تھے (حرّمنا علیہ)"۔

لفظ کے اس عام استعمال کی وجہ سے اہل اسلام ہر گناہ کو
یا عدل الٰہی یا انسانی کے خلاف فعل کو حرام کہا کرتے ہیں۔ تو
بھی یہ کہنا انصاف نہ ہوگا کہ اُن میں حق و ناحق کا امتیاز صرف اتنا
ہی ہے کہ جن چیزوں کی خدا نے اجازت دی وہ حق ہیں اور جن
کی ممانعت کی وہ ناحق ہیں۔ حرام و حلال کے لغوی معنی خواہ اسی
قسم کے ہوں۔ لیکن جیسا استعمال قرآن میں ہوا ہے یا محمد صاحب
کے زمانے میں ان الفاظ کے جو معنی تھے ان الفاظ سے حق و ناحق

افعال کے درمیان بذاتہٖ امتیاز کیا جاتا ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا دیگر الفاظ کی طرح ان کے بھی اخلاقی معنی لینے چاہیئے۔ اِن کو حرام یا حلال محض اس معنی میں نہیں کہ یہ محض حکم پر موقوف ہے۔ خواہ ان الفاظ سے ایسی چیزوں کی اجازت کی طرف اشارہ ہو جو پہلے ممنوع تھیں یا ایسی چیزوں کی ممانعت کی طرف جن کی پہلے اجازت تھی۔ (سورہ آل عمران ۳-۴۴) +

لفظ حِلّہ (بمعنی جائز) اور اُس کے مشتقات پر علیحدہ بحث کرنا چنداں ضروری نہیں۔ اِس کے بارہ میں کافی لکھا جاچکا ہے۔ لفظ شر (بدی) کو نظر انداز کریں۔ قرآن میں یہ لفظ تقریباً ہمیشہ طبعی بدی یا بدنی نقصان کے لئے آیا ہے گو آج کل محمدی علماء اسے اخلاقی معنی میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ سورہ انفال ۸-۲۲ و ۵۷ میں شاید یہ لفظ اخلاقی معنی میں آیا ہو۔

اب ہم آخری لفظ اَظلم (بے انصافی کرنا) اور اُس سے مشتق الفاظ پر غور کریں گے۔ اس لفظ کی جو مختلف صورتیں قرآن میں آئی ہیں جن کا ماخذ ظَلَمَ ہے اُن کے تقریباً ہمیشہ ایک اصطلاحی معنی ہیں۔ اُس لفظ کے اصلی معنی سورہ یوسف ۱۲-۷۹ میں پائے جاتے ہیں۔ "(یوسف نے) کہا کہ اللہ پناہ دے کہ ہم اُس شخص کو چھوڑ کر جس کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے کسی دوسرے شخص کو پکڑ رکھیں ایسا کریں تو ہم ظالم

ٹھیریں"۔ سورہ قصص ۲۸-۵۹ میں بھی یہ لفظ غالباً لغوی معنی میں استعمال ہوا۔

اُن مقامات میں بھی اس لفظ کے یہ معنی پائے جاتے ہیں جس میں لفظ ظالم سے ایسا شخص مراد ہے جو۔ خواہ کسی غرض سے ہو۔ اپنے مفاد کے خلاف عمل کرتا ہے۔ چنانچہ یہ لکھا ہے "(وہ یہ باتیں کرتا ہوا) اپنے باغ میں گیا۔ اور وہ اپنے نفس پر آپ ہی ظلم کر رہا تھا" (سورہ کہف ۱۸-۳۳) + اب اس لفظ کے عام معنی یہ ہیں۔ ناحق کرنے والا۔ یا شریر شخص۔ بمقابلہ اُس شخص کے جو محسن (نیکی کرنے والا) ہے۔ سورہ صافات ۳۷-۱۱۳ میں یہ آیا ہے "ہم نے ابراہیم پر اور اسحٰق پر برکتیں نازل فرمائیں اور ان دونوں کی نسل میں نیکوکار ہیں (محسنؐ)۔ اور (بعض نافرمانیاں کرکے) اپنی جانوں پر صریح ظلم کر رہے ہیں (ظالمٌ)"، اور سورہ نساء ۴-۷۷ میں بھی اس لفظ کا ایسا ہی استعمال ہوا ہے "اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے نجات دے جہاں کے رہنے والے ہم پر ظلم (ظالم) کر رہے ہیں" +

اس لفظ کے اصطلاحی معنی اِس آیت میں آئے ہیں "اُس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ کی آیتوں کو جھٹلائے اور اُن سے کنارہ کشی اختیار کرے" (سورہ انعام ۶-۱۵۸) +

نیز دیکھو ۶-۱۲ و ۳ و ۹ و ۵۳ ا + ۷-۳۵ + ۱۰-۱۸ + ۱۱-۲۱ +
۱۸-۱۴ + ۲-۱۰۸ و ۴ ۱۳ وغیرہ) +

الغرض جو لفظ استعمال ہوئے ہیں اُن سے کسی خاص قسم کی بدی یا خرابی مراد نہیں۔ اور گناہ کے لئے جو مختلف الفاظ آئے ہیں اُن کی نسبت کوئی عام رائے قائم کرنا کہ کونسے اصول پر یہ الفاظ مبنی ہیں اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ہم بیان کر آئے ہیں اُن کی نظرثانی کریں۔

بعض الفاظ تو اس طریقے سے استعمال ہوئے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فلاں فعل اس لئے گناہ یا بد ہے کیونکہ اُس کا بُرا نتیجہ فاعل کو ملتا ہے۔ ایسے فعل خود گنہگار کے مفاد کے خلاف ہیں اور اُس کو نقصان اور خسارہ پہنچاتے ہیں جہاں کہ اُسے فائدے یا نفع کی امید تھی۔ یہ گویا ادنےٰ معنی ہیں جو قرآن میں ان الفاظ کے پائے جاتے ہیں لیکن یہ صحیح رائے ہے۔ اور جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ گناہ کا کامل تصور صرف اِن ہی الفاظ پر مبنی نہیں تو کوئی ایسے معنی پر اعتراض نہ کرے گا۔ گناہ یا تو ایسا فعل ہے جو عین ہمارے مفاد کے خلاف ہے یا جو ہمارے مفاد کے لئے تھا اُس کا نہ کرنا۔ خواہ اُس کا تعلق اِس جہان سے ہو یا اُس جہان سے۔ فعل کی نیت یا فعل کی اخلاقی کیفیت کا جن کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔

اگر اِس کا لحاظ بھی کیا جائے تو کسی فعل کی نیکی یا بدی اُس نیت پر موقوف نہ ہوگی جس سے کہ وہ فعل کیا گیا تھا بلکہ اُس نتیجہ پر موقوف ہوگی جو اُس سے سرزد ہوا۔ اس لحاظ سے گناہ نادانی وجہالت کا نتیجہ ہے۔ لیکن ایسے معاملات میں نادانی مجرمانہ ہے اور فی الواقع بے ایمانی کا دوسرا نام ہے۔

بعض دیگر مقامات ہیں جن میں افعال اِس لئے نیک و بد سمجھے جاتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ہم جنس کے مفاد یا خدا کے حقوق کے خلاف ہیں۔ اس پہلو سے وہ فعل نمودار ہے اور اُس میں خودغرضی کا اصول چھپا ہے۔ گناہ خودغرضی ہے یا انانیت ہے بلا لحاظ دُوسروں کے حقوق کے جن کا خیال ہم کو کرنا چاہیئے تھا۔

دیگر مقامات میں بعض افعال اِس لئے گناہ کہلائے کیونکہ اُن کا حصر انسان و خدا کے درمیان رشتے کے غلط معنی پر تھا۔ آدمی خدا کی مخلوق اور رعیت ہے۔ اور جب ہم اس رشتے کو فراموش کردیں تو جیسی خدمت و عبادت ہمیں چاہیئے وہ کر نہیں سکتے اِس لئے ہم گنہگار ٹھیرے۔ احکم الحاکمین کی نافرمانی یا دانستہ مخالفت کا شاید خیال بھی نہ ہو۔ پھر بھی اُس کا حق ادا کرنے میں ہم قاصر رہے۔

اس نقطۂ خیال سے گناہ یہ ہوا کہ خدا کے ساتھ صحیح سلوک

کرنے میں ہم قاصر رہے - خالق کے وجود کی شہادتیں اس کثرت سے ہیں - اور خدا پر انسان کے حصر کے ثبوت اتنے ہیں کہ خدا کی مستوجب خدمت اور عبادت میں قاصر رہنا جرم اور قابل سزا ہے -

شاید گناہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہو کہ آدمی خدا کے ساتھ اپنے صحیح رشتے کے سمجھنے میں قاصر رہے - شاید گناہ اس امر کا نتیجہ ہو کہ ہم نے خدا کے ساتھ جھوٹا یا غلط سلوک کیا - اور اس سے آدمی ایسے افعال کر بیٹھے جو اُسے اپنے رُتبے کے لحاظ سے کرنے نہیں چاہیئے تھے - ایسے افعال جو اس ضابطہ و قانون کے خلاف ہوں جسے خدا نے آدمیوں کی ہدایت کے لئے مقرر کیا خواہ وُہ شرع اخلاقی ہو یا رسمی - اس لحاظ سے گناہ خدا سے مخالفت ہے - خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ آدمی خدا کی اطاعت سے انکار کرے یا اُس کے صریح احکام کے خلاف کرے - دونوں صورتوں میں جس روح کا اظہار اس میں ہوا وُہ خود اعتباری اور انانیت کی روح ہے جس کے ذریعے سے انسان اپنے آپ کو اور اپنی رائے کو دانستہ خدا اور اُس کی مرضی کے خلاف کھڑا کرتا ہے -

بالآخر - گناہ اشیا کی غایت حقیقت کی عدم تسلیم ہے - یعنی جو ناراست اور فانی ہے اس کو راست اور غیر فانی پر فوق دینا -

گناہ کے بارے میں جو یہ رائیں ہیں اُن میں یہ خیال پایا جاتا

ہے - بعض اوقات تو وُہ بالکل پوشیدہ ہے - لیکن ہمیشہ یہ موجود ہے اور بعض اوقات یہ خیال بالکل آشکارا اور ہویدا ہے - کہ ان سب افعال کا ماخذ اور چشمہ ایک ہی ہے - گناہ کا واحد چشمہ بے ایمانی ہے - ان مختلف بد افعال کے مرتکب ہونے میں خدا پر بے اعتقادی کی روح کا اظہار ہوتا ہے - اُس خدا کی نسبت بے اعتقادی کا جو نہ صرف مکاشفہ یا الہامی کتابوں میں مذکور ہے بلکہ جس نے فطرت اور انسان کے ضمیر میں بھی اپنی شہادت ظاہر کی ہے -

سوم

اب ہم ایک دوسرے پہلو سے گناہ کے بارے میں قرآن کی تعلیم پر غور کریں گے - جس پہلو سے کہ محمد صاحب نے گناہ کا تصور کیا - جس طریقے سے کہ اُنھوں نے گنہگاروں کے افعال کا اور گناہ کرتے وقت اُن کی نیت و احساس کا بیان کیا -

اول تو ہم اس آیت کو پیش کرتے ہیں جس میں شیطان (ابلیس) کے گناہ کا بیان ہے - "جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے آگے جُھکو تو شیطان کے سوا (سب کے سب) جھک پڑے - اُس نے نہ مانا اور شیخی میں آگیا اور نافرمان بن بیٹھا" (سورہ بقر ٢-٢٣) - اس قصے کا جو دُوسرا بیان ہے وُہ

بھی قابل ذکر ہے۔ "تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں مٹی سے ایک انسان بنانے والا ہوں۔ تو جب میں اُس کو پورا کر چکوں اور اپنی روح اُس میں پھونک دُوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ چنانچہ سب ہی فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ایک ابلیس نے کہ شیخی میں آگیا اور نافرمان بن بیٹھا۔ خدا نے (ابلیس سے) پوچھا کہ اے ابلیس جس چیز کو ہم نے اپنے ہاتھوں بنایا۔ اُس کو سجدہ کرنے سے تجھے کون چیز مانع ہوئی۔ کیا تو شیخی میں آگیا؟ یا تو (فی الواقع) بڑے لوگوں میں سے ہے۔ وہ (بولا اُس کو کیونکر سجدہ کروں)۔ میں اُس سے کہیں بہتر ہوں۔ مجھ کو تو نے آگ سے بنایا اور اُس کو تُو نے مٹی سے بنایا"۔ (سورہ صٓ ۳۸ - ۷۱ سے ۷۷ - ۱۰ سے ۱۲)+

اس تحقیقات میں یہ مقام بہت مفید ہے۔ کیونکہ اس میں گناہ کی ابتدا کا بیان نہ صرف قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے بلکہ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ محمد صاحب نے ابلیس کے گناہ کی حقیقت کیا سمجھی۔

یہ قابل غور ہے کہ فرشتوں کو جس امر کے تسلیم کرنے کا حکم ہوا۔ وہ یہ تھا کہ آدم (یعنی انسان) روحانی طور پر اُن سے اعلیٰ تھا۔ کیونکہ خدا نے اپنی روح اُس میں پھونکی تھی۔ انسان کی اس فوقیت کو تسلیم کرنا اس امر سے دکھایا گیا کہ وہ اُس کے آگے

گریں یا سجدہ کریں۔ اور یہاں یہ لفظ سجدہ آیا ہے نہ عمداً۔

بعض لوگوں نے اس مقام پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ایک طرف تو خدا حکم کرتا ہے کہ صرف اُس کی عبادت کی جائے اور اُدھر فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کریں۔ اس مقام کی غلط فہمی کی بنا یہ لفظ سجدہ ہے۔ لیکن اگر اسے تعظیمی سجدہ سمجھیں تو یہ غلط فہمی جاتی رہے گی۔ یہ تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ تعظیمی سجدہ عبادت کا جزو ہو گا۔ لیکن یہ بذات خود عبادت نہیں۔ ابلیس نے آدم کی ایسی تعظیم کرنے سے انکار کیا کیونکہ اُس نے اپنے تئیں آدم سے اعلیٰ سمجھا اس لیے کہ آدم مٹی سے پیدا ہوا اور وہ خود آتش کے لطیف مادے سے۔ قرآن نے اس گناہ کا منبع تکبر کو قرار دیا جس کی وجہ سے ابلیس نے خدا کے صریح حکم کے خلاف اپنی بزرگی پر زور دیا پس ایسے موجود کے لیے جو تکبر کر کے خدا کے آگے شیخی بگھارے یہ شایاں نہ تھا کہ وہ آگے کو فردوس میں رہے۔ اس لیے ابلیس وہاں سے نکالا اور راندہ گیا۔ "خدا نے فرمایا تو بہشت سے نیچے اُتر کیونکہ تیری اتنی ہستی نہیں کہ تو بہشت میں شیخی مارا کرے تو نکل جا بے شک تو ذلیلوں میں کا ایک ذلیل تو ہے ہی"۔ (سورہ اعراف ۷ - ۱۲)+

یہی خیال کہ گناہ کی جڑ تکبر اور خدا کے آگے گستاخانہ مخالفت

ہے قرآن کے اُن مقامات میں اکثر پایا جاتا ہے جہاں انسان کی گنہگاری کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ ہامان۔ فرعون کے جرنیل کے بارے میں لکھا ہے "اور فرعون اور اُس کے لشکروں نے ناحق ملک میں سر اُٹھایا اور اُنہوں نے ایسا سمجھا کہ وہ ہمارے پیچھے (ہماری طرف لوٹا کر نہیں لائے جائیں گے" (سورہ قصص ۲۸-۳۹) - ایسا ہی قوم ثمود کے بارے میں آیا "اُس کی قوم میں جو لوگ رعُودار (اور) بڑے (آدمی تھے غریب لوگوں سے جو اُن میں سے ایمان لے آئے تھے لگے پوچھنے۔ کیا تم کو تحقیق معلوم ہے کہ صالح (واقع میں) رسول خدا ہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ جو حکم اُن کو دے کر ہماری طرف بھیجا گیا ہے ہمارا تو اُس پر ایمان ہے۔ اس پر جن کو بڑا گھمنڈ تھا لگے کہنے کہ جس چیز پر تم ایمان لے آئے ہو۔ ہم تو اُس سے منکر ہیں" (سورہ اعراف ۷-۷۳ و ۷۶+ نیز دیکھو ۳۹-۶۰ - ۸+ ۸۶ - ۷+ ۲۳-۳۳+ ۲۵-۲۳+ ۳۹-۳۳ سے ۶۰+ ۴۰-۳۷ و ۳۹ و ۶۲ وغیرہ +

الغرض اس امر میں قرآن کی تعلیم پر حد سے زیادہ زور دیئے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ گناہ کا جو تصور محمد صاحب کے دل میں تھا اور جس بنیادی پتھر پر اُنہوں نے مسئلہ گناہ کی بنیاد ڈالی وہ یہی تھا کہ گناہ کی جڑ تکبر اور خدا کی گستاخانہ مخالفت ہے۔ تو بھی ساتھ ہی یہ بیان کر دینا ضرور ہے کہ ایسا کہنے سے ہماری یہ مراد نہیں

کہ محمد صاحب کے دل میں یہ تصور بہت ہی صاف اور واضح تھا۔ ہم میں سے چند ہی ایسے اشخاص نکلیں گے جو اپنے عقائد کو پرکھتے ہوں یا اپنی تعلیم کے اصولوں کو ایسے غور و خوض سے آزماتے ہوں جس سے کہ اُن کو یہ بخوبی واضح ہو جائے کہ ان اصولوں کی بنیاد کن امور پر رکھی گئی تھی۔ کیونکہ ایسی بنیاد تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو گی خواہ ہم اُسے جانیں یا نہ جانیں۔ خاص کر شاعروں پر یہ بات صادق آتی ہے۔ اور محمد صاحب فطرتاً اور طبعاً شاعر تو تھے۔

جن آیتوں کو ہم اُوپر لکھ آئے ہیں اُن میں یہ تصور نمایاں ہے کہ گناہ کا منبع و ماخذ مشیت ایزدی کی مخالفت ہے۔ اور اس مخالفت کا بنیادی اصول خودی اور متکبرانہ شیخی ہے۔ یعنی یہ سمجھ لینا کہ فلاں امور میں میری ہی رائے درست ہے اور اس خیال سے آدمی خدا کے ارادے اور حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ مگر یہ قابل لحاظ ہے کہ یہ مخالفت کسی مقدس ارادے کی خلاف ورزی نہیں۔ یہ جائز اختیار یا حاکم کے آگے گستاخی ہے نہ پیارے باپ کی مخالفت میں خود رائی۔ یہ باغی رعیت کی مخالفت اور ناشکر گزاری ہے نہ گمراہ خطاکار بچے کی نافرمانبرداری اور ناشکر گزاری۔

علاوہ ازیں یہ اس خودغرض۔ متکبر اور شیخی باز غرور کی رُوح

سبب ہے جو اُس گناہ کی جڑ ہے جس کے لئے کوئی معافی نہیں۔ جو شخص ایسی روح سے بھرا ہو خدا کا فضل اُس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتا۔ اور قرآن نے یہ بتایا کہ جہاں ایسی روح موجود ہوگی وہاں خدا کا موثر فضل اُن کو عطا نہ ہوگا۔ "جو لوگ ملک میں اکڑتے پھرتے ہیں ہم اُن کو اپنے احکام سے برگشتہ کئے رہیں گے اور سب معجزے بھی دیکھیں تاہم اُن پر ایمان نہ لائیں اور اگر سیدھا رستہ دیکھ پائیں تو اُس کو اپنا مسلک نہ بنائیں اور اگر گمراہی کا رستہ دیکھ پائیں تو اُس کو اپنا مسلک بنالیں۔ یہ کج روی اُن میں اس سے پیدا ہوئی کہ اُنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور اُن سے بے پروائی کرتے رہے" (سورہ اعراف ۷ رکوع ۱۴۶)۔ گو یہ الفاظ کچھ سخت معلوم پڑیں لیکن یہ متی ۱۲ ۳۲ کے الفاظ کو یاد دلاتے ہیں جہاں لکھا ہے "جو کوئی روح القدس کے برخلاف کوئی بات کہے گا وہ اُسے معاف نہ کی جائے گی نہ اس عالم میں نہ آنے والے میں"۔ ان دونوں صورتوں میں خدا کی روح کے اظہار کے نشان دیکھ کر اُن کو جھوٹ ٹھیرانا یا شیاطین سے اُن کو منسوب کر ڈالنا اور مزاج کی ایسی حالت کو ظاہر کرتا ہے جس کے نزدیک فضل الٰہی آنہیں سکتا۔ قرآن کے مذکورہ بالا مقام کو پڑھتے وقت ہم مقدس پولس کے یہ الفاظ بھی فراموش نہ کریں "باقی سخت کئے گئے"۔ چنانچہ لکھا ہے کہ

خدا نے انہیں آج کے دن تک سست طبیعت دی اور ایسی آنکھیں جو نہ دیکھیں اور ایسے کان جو نہ سنیں" (رومیوں ۱۱۔ ۷ و ۸)۔

ازروئے قرآن خدا سے ایسی مخالفت کرنے کا یہ نتیجہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کی ہستی ہی کا انکار کر دے یا حقیقی واحد خدا کے ساتھ دوسرے معبودوں کی پرستش کرنے لگے۔ یا خدا اور اُس کی ہستی کو تسلیم کر کے اُس کی اور اُس کے مطالبات کی مخالفت کرے۔ خدا کی مرضی و مکاشفے کی مخالفت کی یہ صورت یا اظہار اس امر کے دعوے میں ظاہر ہوتا ہے۔ خواہ وہ دعویٰ لفظی ہو۔ یا عمل میں کہ انسان اپنے اعمال کے لئے خدا کے آگے جواب دِہ نہیں۔ اور نہ کوئی قیامت ہے اور نہ روزِ عدالت۔ اس بیان کی تائید میں قرآن سے آیات پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ وہ ساری کتاب اس خیال سے مملو و معمور ہے کہ جو شخص ذرا سمجھ کر اُس کا مطالعہ خواہ سرسری طور پر ہی کرے وہ فوراً جان لیتا ہے کہ محمد صاحب کی تعلیم میں اس مسئلہ کا درجہ کیا ہے۔

خدا کو خالق مطلق اور جہان کا حاکم مطلق ماننے کی ضرورت کو سب نے تسلیم کر لیا ہے جس پر محمد صاحب نے بہت زور دیا۔ اور خدا پر ایسا ایمان رکھنے کے بغیر خدا کو خوش کرنا ناممکن

ہے۔ کیونکہ دین کا یہ مقدم اور اہم تقاضا ہے۔ اِس لئے اُس کا عدم ہمارے گناہ کا سرچشمہ اور منبع ہے۔ لیکن خدا پر ایسا ایمان رکھنے کے ساتھ اُس کی اطاعت بھی لازم ہے یعنی یہ کہ ایماندار یہ ارادہ کرے کہ میں اپنی روش نہ صرف رسمیات کے بارے میں بلکہ عقیدے اور اخلاق کے بارے میں بھی حتی الامکان خدا کی مرضی کے مطابق بناؤں گا۔ اور یہ دعویٰ ہے کہ قرآن میں یہ تعلیم کافی طور سے بیان ہوئی ہے۔ یہ دو باتیں۔ یعنی خدا پر ایمان رکھنا اور اُس کی اطاعت کرنا۔ اس امر کے لئے کافی ہیں کہ آدمی بے ایمانوں کے زمرے سے نکل کر ایمانداروں کے زمرے میں داخل ہو جائے۔ یہاں لفظ ایماندار عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

لیکن پورے معنی میں آدمی کی نجات کے لئے یہ دو باتیں گو بہت ضروری ہیں لیکن کافی نہیں۔ اس منزل پر پہنچنے کے بعد آدمی کی نجات یا وہ اجر جو انسان عاقبت میں حاصل کرے گا۔ وہ بہت کچھ اس پر حصر رکھتا ہے کہ جو طبعی میلان بدی کی طرف ہیں آدمی اُن پر غالب آئے۔ کیونکہ یہ میلان ہی آدمی کو نیچے دبا دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لکھا ہے۔ "اور جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو گا تو اُس کو نہ بے انصافی کا خوف ہو گا اور نہ حق تلفی کا" (سورہ طٰہٰ ۲۰-۱۱۱) +

نجات کے متعلق قرآن کی تعلیم پر بحث کرتے وقت اس امر کو بالتفصیل بیان کریں گے[1]۔ ہم نے یہاں اس کا ذکر صرف اس لئے کیا تا کہ مسئلہ گناہ پر کچھ روشنی ڈالے۔ کیونکہ اس سے یہ عیاں ہے کہ جس قول یا فعل میں خدا کی ہستی کا انکار یا خدا کی مرضی کی غایت و مطلق مخالفت نہ ہو وہ کسی آدمی کو ایمانداروں کے دائرے سے خارج نہیں کرتا۔ اس لئے گناہ بذاتہ خدا کے بارے میں بے ایمانی اور اُس کی مرضی کی مصمم مخالفت ہے۔

اسی وجہ سے گناہ کی تقسیم کبیرہ و صغیرہ کی جاتی ہے۔ یہ تقسیم صاف طور پر قرآن میں آئی ہے۔ اگرچہ وضاحت کے ساتھ قرآن میں ان کی تعریف تو نہیں آئی جس سے ہم اُن میں امتیاز کر سکیں لیکن جب محمدی علماء کبیرہ و صغیرہ گناہوں میں امتیاز کرتے ہیں تو وہ کلام دہ محمد صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ آیا قرآن کے لحاظ سے اُن کی یہ تقسیم درست ہے اس پر بحث کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ مگر اتنا تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن میں مصمم بے ایمانی ایسا گناہ ہے جس کے ذریعے سے انسان مطلقاً ایسی حالت میں جا پڑتا ہے جہاں اُسے نجات کی کچھ امید نہیں۔ اور علاوہ ازیں اگر ایماندار لگاتار صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتا رہے جس سے یہ ظاہر ہے کہ خدا کی مرضی کی

[1] دیکھو رسالہ تعلیم نجات از روئے قرآن

اطاعت کرنے کی اُسے کوئی حقیقی خواہش نہیں تو ایسا سمجھنے کی صریح اور معقول وجہ ہے کہ ایسا شخص فی الواقع بے ایمان ہے۔ کیونکہ متواتر صغیرہ گناہوں کے ارتکاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے شخص میں راست بازی پر چلنے کا سچا ارادہ اور کوشش کالعدم ہے۔

پس حقیقی ایماندار کا درجہ ویسا ہی سمجھا جاتا ہے جیسے عہد عتیق میں اُس شخص کا تھا جس کا دل خدا کے ساتھ راست تھا۔ یہ ایسا شخص نہ تھا کہ جس سے کبھی گناہ سرزد نہ ہوا ہو بلکہ ایسا شخص تھا جو خدا کی مرضی پر چلنے کا پکا ارادہ رکھتا تھا اور اُس کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی کو سدھارتا تھا۔ اس میں خواہ وُہ کامیاب ہوا یا بعض اوقات ناکام رہا۔ اور شاید بہت بُری طرح سے ناکام رہا اس پہلو سے اس پر یہاں غور نہیں کیا جاتا۔

یہ ایسا شخص تھا جو خدا پر ایمان لایا جس نے دل کے سچے اور پورے ارادے سے خدا کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ جیسا ہم نے ذکر کیا۔ قرآن کی یہی تعلیم ہے۔ نہ ایسے لوگ جو خدا پر ایمان لاتے۔ بلکہ ایسے لوگ جو خدا پر ایمان بھی لاتے اور راست بازی کرتے ہیں سچے مومن یا ایماندار ہیں۔ اِن کے بالمقابل وُہ گنہگار ہیں جو خدا پر ایمان نہیں لاتے اور جن کی بے ایمانی اُن کے راست بازی حاصل نہ کرنے کا باعث ہے۔

یعنی اُن کے سارے گناہ گا۔

اب ہم ذرا پرتہ بدلتے ہیں اور جس طریقے سے محمد صاحب نے اُن گناہوں کا ذکر کیا جو رسمی شرع کے خلاف تھے اُس پر غور کریں گے۔ بعضوں نے تو یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن نے ٹھیک طرح سے رسمی ناپاکی اور اخلاقی گمراہی میں کوئی امتیاز نہیں کیا اور دونوں کو یکساں مستوجب سزا سمجھا۔ چنانچہ جس زور سے رسمی شریعت کے گناہوں پر ملامت کی ویسے ہی زور سے اخلاقی گناہوں پر۔ لیکن آگے قدم بڑھانے سے پیشتر ہم یہ صاف طور سے جتا دینا چاہتے ہیں۔ خواہ اس امر کے لحاظ سے یا دوسرے گناہوں کے لحاظ سے۔ کہ ہم یہاں محمدی علماء کی تعلیم کا مطالعہ نہیں کر رہے۔ اور نہ احادیث پر توجہ کر رہے ہیں کہ محمد صاحب نے کیا کہا اور نہ محمدی عقیدے اور عمل کی اُن صورتوں پر غور کر رہے ہیں جن کو آج کل محمدی مانتے ہیں۔ لیکن ہم تو صرف قرآن کی تعلیم پر غور کر رہے ہیں جیسی کہ وُہ قرآن میں مندرج ہے جیسے محمد صاحب نے خود سکھایا۔ اس لئے گو یہ سچ ہو کہ مروجہ محمدی تعلیم کے مطابق اخلاقی قصور اور شرعی خطائیں یکساں گناہ قرار دیئے جائیں لیکن ہم اس کے بارے میں یہاں کچھ کہنے کو تیار نہیں۔ ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا قرآن میں ان کا ایسا ہی ذکر ہے یا نہیں۔ اور اگر وہاں بھی ایسا ہی ذکر ہے تو ہم یہ دریافت

کریں کہ محمد صاحب نے رسمی شریعت کے توڑنے کو خدا کی نظر میں ایسا ہی بُرا سمجھا جیسا کہ اخلاقی شریعت کے توڑنے کو۔

ہم صرف قرآن کی اُس آیت کو یہاں نقل کریں گے جس میں قرآن نے گناہ کا تمام بیان کیا۔ "بے شک آدمی بڑا ہی تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے کہ جب اُس کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اُس کو فائدہ پہنچتا ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ (مگر اُن لوگوں کا ہرگز ایسا حال نہیں) جو نماز گزار ہیں۔ وُہ اپنی نماز کو کبھی ناغہ نہیں ہونے دیتے اور جن کے مالوں میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے کا ایک حصّہ معین ہے اور جو روز جزا کا یقین رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ بے شک اُن کے پروردگار کا عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں اور وُہ جو اپنی شرمگاہوں کو بچائے رہتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور اپنے ہاتھوں کے مال (لونڈیوں) سے اُن پر کچھ الزام نہیں۔ ہاں جو لوگ اِن کے علاوہ کے طلب گار ہوں۔ تو اُن کو سمجھو کہ، وُہ حد (فطرت) سے بڑھ گئے ہیں۔ اور وُہ جو اپنی تحویل کی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے اور وُہ جو اپنی گواہیوں پر ثابت قدم رہتے۔ اور وُہ جو اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں یہ لوگ ہیں جو عزت سے بہشت کے باغوں میں ہوں گے" (سورہ معارج ۷۰۔ ۱۹ سے ۳۵ + نیز دیکھو ۶۔ ۹۱ + ۲۳۔ ۱ سے ۹)+

دیگر فرائض کے ساتھ نماز ادا کرنے کے فرض کا ذکر بھی آیا۔ اور اس ادا کے فرض میں وضو بھی داخل ہے جو نماز سے پیشتر ہونا چاہیئے۔ عین فعل نماز میں محض چند الفاظ کے پڑھنے ہی کا حکم نہیں بلکہ دلی نماز لازمی شرط ہے۔ "اے مسلمانو تمام نمازوں کا عموماً اور بیچ کی نماز کا خصوصاً تقید رکھو اور نماز میں اللہ کے آگے ادب سے کھڑے رہو" (سورہ بقرہ ۲۔ ۲۳۹)۔

علاوہ ازیں یہ الفاظ بھی ادب سے ادا ہوں نہ بہت بلند آواز سے۔ نہ بہت دھیمی آواز سے کہ لاپروائی سے زبان سے نکلیں۔ "اور نہ تو اپنی نماز چلا کر پڑھ۔ اور نہ اُس کو بالکل چپکے پڑھ بلکہ ان دونوں کے بیچ (ایک متوسط) طریق اختیار کر" (سورہ بنی اسرائیل ۱۷۔ ۱۱۰)+

نماز سے پیشتر وضو اس امر کا ظاہری نشان ہے کہ ایماندار تعظیم و طہارت کے ساتھ خدا کے قریب آنے کی آرزو رکھتا ہے۔ یہ ظاہری طہارت اندرونی طہارت کا نشان ہو جو خدا اپنے نمازی کو عطا کرتا ہے تاکہ اُس کی نماز مقبول ہو۔ محض پانی کے دھونے سے ایماندار کو پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی کیونکہ جب پانی دستیاب نہیں ہوتا تو صاف ریت یا مٹی کو استعمال کرنے کا حکم ہے جسے تیمم کہتے ہیں۔ صرف خدا ہی ایماندار کو پاک کرتا ہے۔ لیکن ایماندار کا یہ فرض ہے کہ وُہ اس پاکیزگی کی تلاش کرے اور

اس ظاہری نشان کے ذریعے سے اس کی اور اس کے قبول ہونے کی آرزو ظاہر کرے۔ چنانچہ یہ لکھا ہے "اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔ . . . . اور تم کو پانی میسر نہ ہو تو ستھری مٹی لے کر اُس سے تیمم یعنی اپنے مُنہ اور ہاتھوں کا مسح کر لو۔ اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی کرنی نہیں چاہتا بلکہ تم کو صاف ستھرا رکھنا چاہتا ہے اور نیز یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا احسان پورا کرے تاکہ تم شکر کرو" (سورہ مائدہ ۵-۹)۔ دل کی حقیقی پاکیزگی جس کے ساتھ ایماندار خدا کے نزدیک آسکتا ہے وہ خدا کا عطیہ ہے۔

رسمی اور اخلاقی شریعتیں دو مختلف و متفرق امور ہیں۔ یہ تو یقینی بات ہے لیکن جسے ہم رسمی فرض سمجھتے ہیں اُس کو توڑنے میں قصوروار کا ارادہ اخلاقی طور پر بد ہو سکتا ہے۔ یہاں محض فعل کا ذکر نہیں بلکہ فاعل کے ارادے و نیت کا ذکر ہے۔ جو شخص اُسے گناہ سمجھ کے کرتا اُس کے لئے وہ گناہ ہے۔ کیونکہ اس میں خدا کی بے ادبی ہے اور اُس کی عظمت اور قدسیت پر حملہ ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مسیحی نقطہ خیال سے نہیں بلکہ محمد صاحب کے نقطہ خیال سے نظر ڈالیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ رسمی اور اخلاقی شریعتیں مساوی ہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ رسمی شریعت کے توڑنے سے آدمی اپنی ہی رائے کے مطابق خدا کی سخت بے ادبی کرنے کا مجرم ٹھیرتا ہے اور یہی گناہ کی

حقیقت ہے۔ ایسی شرع کا توڑنا۔ نہ نادانستہ توڑنا۔ بلکہ عمداً اور دانستہ توڑنا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہاں وہی بے ایمانی اور خدا کی گستاخانہ مخالفت کی روح موجود ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور یہ روح ازروئے قرآن گناہ کی جڑ ہے۔

چہارم

اب ہم اس مضمون کے ایک دوسرے پہلو پر غور کریں گے کیونکہ اُن مقامات سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں کہ محمد صاحب کے تصورِ گناہ کے بارے میں کیا تھے۔ جن میں اُن لوگوں کی صفات کا ذکر آیا ہے جو بہشت کے مکانوں میں آزادانہ داخل ہوں گے۔ یعنی جو خدا کے مقبول ہیں

یہ لفظ "نیکوکار" (آل-ابرار) قرآن میں عام معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ خاص کر ایسے لوگوں کے لئے جن کا درجہ خدا کے نزدیک ایسا ہے جس سے اُن کا بہشت کی خوشیوں میں داخل ہونا یقینی ہے۔ چنانچہ اس لفظ کا یہ استعمال ان آیتوں میں آیا ہے "بے شک نیک (الابرار) آرام میں ہوں گے" (سورہ مطففین ۸۳-۲۲)، "بے شک نیکوکار (الابرار) البتہ مزے میں ہوں گے (سورہ انفطار ۸۲-۱۳)، "لیکن بے شک بدکار البتہ دوزخ میں ہوں گے"۔ نیکوکار وہی لوگ کہلاتے ہیں جو صاحب نیکی

ہیں جنہوں نے نیکی کی ہے - اور یہ نیکی محض ظاہری عمل نہیں - " یہ کچھ نیکی نہیں ہے کہ گھروں میں اُن کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جو پرہیزگاری کرے " (سورہ بقر ۲ - ۱۸۵) + " (مسلمانو) نیکی (البر) یہ نہیں کہ اپنا منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی (البر) تو اُن کی ہے جو اللہ اور روز آخرت اور فرشتوں اور آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے - اور مال اللہ کی حُبّ پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور گردنوں کے چھڑانے میں (دیا) اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہے - اور جب (کسی بات کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پُورے اور تنگی میں اور تکلیف میں اور ہلاچلی کے وقت میں ثابت قدم رہے - یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں (جن کو پرہیزگار (کہنا چاہیئے) " (سورہ بقر ۲ - ۱۷۲) + نیز دیکھو ۲۳ - ۱ سے ۱۰ + ۲۶ - ۱۸۱ سے ۱۸۴ + ۷۶ - ۷ سے ۱۰ + ۹۲ - ۱۷ سے (۲) +

پہلا اصول ایمان ہے - یعنی خدا پر ایمان لانا اور راستباز شخص کی وہ ساری صفات - خوبیاں اور خواص اسی سے پیدا ہوتی ہیں - مذکورہ بالا آیت میں تین امور کے لحاظ سے راستباز شخص کا بیان ہوا - اوّل اس لحاظ سے کہ اُس کا رشتہ خُدا

سے ہے - کہ اُس کا فرض یہ ہے کہ خدا پر وہ ایمان لائے اور جو کچھ اُس نے منکشف کیا ہے اُس کو مانے - دوم - وہ اپنے ہم جنس بھائیوں سے خوش سلوکی کے ذریعے خدا کو خوش کرنے کی آرزو ظاہر کرے - وہ اُن سے سخاوت - شفقت اور مروت کا سلوک کرے کیونکہ اُس کی آرزو خدا کو خوش کرنے کی ہے - سوم - اور دین کے اصولوں کے مطابق اپنی زندگی سدھارے اور باقاعدہ دینی فرائض ادا کرے اور ہر حالت میں یعنی دُکھ میں اور سُکھ میں اپنی رفتار سے یہ ظاہر کردے کہ وہ خدا کی مرضی کے تابع ہے - اور خدا کے ساتھ ایسے برتاؤ خدا کی شکرگزاری کے ذریعے سے ظاہر کرے کیونکہ قرآن نے اس فرض کا اکثر ذکر کیا ہے -

ظاہری یا عقلی طور سے اس تعلیم کو ماننے کے ساتھ ساتھ روح کی روحانی و اخلاقی حالت ایسی ہو جو کہ باطنی خالص تیقن کا پھل ہے - " یہ (لوگ) اُس روز بہ نسبت ایمان کے کفر سے نزدیک تر تھے - منہ سے ایسی بات کہتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں " (سورہ آل عمران ۳ - ۱۶۱) + اور جب کہ خلوص قلبی سے بھی یہ تعلیم مان لیں - اور خدا کو خوش کرنے اور اُس کی اطاعت کرنے کی آرزو دل میں موجود ہو پھر بھی پورا ایماندار بننے کی خاطر کچھ اور بھی درکار ہے - اُس کو فرمانبردار

اور اطاعت کے سبق سیکھتے ہیں جب تک کہ وُہ دل نشین نہ ہو جائیں اور اُس کی زندگی کا جزو نہ بن جائیں اور اُس کا دل اور مزاج بدل نہ جائے۔ "عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ اُن سے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ ہاں یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے اور ایمان کا تو ہنوز تمہارے دلوں میں گزر تک بھی نہیں ہوا" (سورہ حجرات ۴۹-۱۴)۔ اور مومن کے فرائض ادا کرنے میں اطاعت کا ظاہری فعل ہی کافی نہیں کہ آدمی ٹھیک یہ فیصلہ دے سکے کہ ایسا فعل مناسب طور سے ادا ہوا یا نہیں۔ ان ظاہری اعمال کے مطابق اندرونی دینداری ہونی چاہیئے جس کا ظاہری ظہور یہ اعمال ہیں۔ جن لوگوں نے ظاہری عمل تو کئے لیکن باطنی مزاج و طبیعت اُس کے مطابق نہ بنائی وُہ خدا کی نظر میں مقبول نہیں ہو سکتے۔ دیکھو سورہ توبہ ۹-۵۳ و ۵۴ "(اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم خوش دلی سے خرچ کرو یا بے دلی سے تمہاری خیرات تو خدا کے ہاں، کسی طرح قبول ہونی نہیں۔ کیونکہ تم نافرمان لوگ ہو۔ اور ان کی خیرات کے قبول ہونے کی اور کوئی وجہ مانع نہیں ہوئی۔ مگر یہی کہ اُنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کی۔ اور نماز کو آتے ہیں تو بس الکسائے ہوئے اور خرچ کرتے ہیں تو بس بد دلی سے"۔

کیونکہ خدا کے سامنے جو قربانی گزرانی جاتی ہے وُہ بھی اطاعت کا نشان ہے اور جب تک کہ ایماندار اور تائب دل سے گزرانی نہ جائے وُہ مقبول نہیں ہو سکتی۔ "جو لوگ اُن چیزوں کا ادب ملحوظ رکھتے جو خدا سے نامزد کی گئی ہیں تو یہ دلوں کی پرہیزگاری میں داخل ہے" (سورہ حج ۲۲-۳۳) + جو اونٹ قربانی میں خدا کے سامنے گزرانے جائیں اُن کی نسبت اسی سورہ کی ۳۷ آیت میں یہ لکھا ہے "خدا تک نہ تو ان کے گوشت ہی پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون بلکہ اُس تک تمہاری پرہیزگاری اور فرماں برداری پہنچتی ہے"۔

ایسے فرائض مثلاً خیرات کے ادا کرنے میں بھی خیرات دینے والے کی نیت یعنی خود نثاری درکار ہے۔ اسی کی وجہ سے اُس فعل کی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ "(لوگو) جب تک (خدا کی راہ میں اُن چیزوں سے، نہ خرچ کرو گے جو تم کو عزیز ہیں نیکی کو ہرگز نہ پہنچ سکو گے" (سورہ آل عمران ۳-۸۶)۔ ایک دوسری آیت میں شعیب کے وعظ کو پسند کیا گیا۔ شعیب نے عملی دین کا تقاضا کیا جو اس پر مشتمل تھا کہ آدمی اور آدمی کے مابین عادلانہ سلوک اور راست روش اور چلن ہو۔ "پیمانہ بھر کر دیا کرو اور نقصان پہنچانے والے نہ بنو۔ اور ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں کمی سے نہ دیا کرو۔ اور ملک میں فساد

نہ پھیلاتے پھرو اور اُس سے ڈرتے رہو جس نے تم کو اور اگلی خلقت کو پیدا کیا"۔ (سورہ الشعرا ۲۶۔ ۱۸۱ سے ۱۸۴ تک)۔

شفقت، ہمدردی۔ اور محتاج و بیکس کی مدد خدا پر حقیقی ایمان رکھنے اور خدا کو خوش کرنے کی سچی خواہش کے نشان ہیں۔ اور کسی دنیاوی نفع یا فائدے کی خاطر یہ عمل میں نہ آئیں بلکہ محض اس آرزو سے کہ خدا کا فضل و عنایت حاصل کریں "یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی منتیں پوری کرتے ہیں اور اُس روز سے ڈرتے ہیں جس کی مصیبت پھیلی ہوئی ہے اور خدا کا حب کر کے محتاج اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں اور ان کو جتا بھی دیتے ہیں کہ ہم تو تم کو صرف خدا کا منہ کر کے کھلاتے ہیں ہم کو تم سے نہ بدلہ درکار ہے اور نہ شکرگزاری۔ ہم کو اپنے پروردگار سے اُس دن کا ڈر لگ رہا ہے جب لوگ مارے رنج کے منہ بنائے تیوری چڑھائے ہوں گے" (سورہ دہر ۷۶۔ ۷ سے ۱۰)۔ اور پھر یہ لکھا ہے۔ "اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اُس سے دُور ہی رکھا جائے گا وہ ایسا (دل کا سخی ہے) کہ اپنا مال (راہ خدا میں) دیتا ہے تاکہ (اُس کا نفس بخل کے عیب سے) پاک ہو اور کسی کا اُس پر کوئی احسان نہیں (کہ اس دینے سے اُس کو) اُس کا بدلہ اُتارنا (مقصود) ہے۔ اُس کو تو صرف اپنے پروردگار عالی شان کی رضا جوئی منظور ہے اور بس۔

اور خدا اُس سے ضرور راضی بھی ہوگا" (سورہ الیل ۹۲۔ ۱۷ سے ۲۱)

ایسے اعمال کی اخلاقی قدر و قیمت مختلف صورتوں میں مختلف ہوگی۔ کیونکہ اُن کا انحصار پرستاروں کی نیت پر ہے جو افعال کہ بذات خود قابل تحسین ہیں اُن کے پورا کرنے میں ایماندار کی دلی حالت اُس فعل کو حقیقی اطاعت و عبادت کا فعل بناتی ہے۔ سارے اخلاقی اور روحانی اور رفاہ عام کے کاموں کا چشمہ اس امر کو حقیقی طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ خدا کون ہے اور آدمی کا شخصی رشتہ اُس سے کیا ہونا چاہیئے۔ اور اُن کو ہم صرف خدا کو خوش کرنے کی نیت سے بجا لائیں اور اپنے دل کو اطمینان دیں کہ وہ خدا کے سامنے قبولیت کے قابل ہیں۔ الغرض وہ خدا ہی کو مدنظر رکھ کر اور اُس کے قبول ہونے کی خاطر سے عمل میں آئیں۔ اور اس کے برعکس ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ محمد صاحب کی تعلیم کی رُو سے وہ فعل خدا کو ناپسند ہے جس میں خدا کو خوش کرنے کی آرزو کالعدم ہے۔ اور خاص کر ایسا مزاج اُن میں پایا جاتا ہے جو انسان کو خدا کا مخالف بنا دیتا ہے۔

پس جو انسان خدا کو خوش آتا ہے اُس کی صفات اور خوبیوں کا لحاظ کر کے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے جو ہم بیان کر آئے ہیں۔ پس از روئے قرآن جو اصول گناہ کی تہ میں چھپا ہوا

ہے وہ یہی بغاوت وغیر محتاجی کی روح ہے جو یا تو خدا اور اُس
کے فرائض کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے یا غرور اور گستاخانہ
سیری سے خدا کی مخالفت میں کھڑی ہوتی ہے۔ پس گناہ دل
کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ انسان کی مرضی کا باغیانہ فعل جس
کی وجہ سے انسان اپنے جائز خداوند اور مالک کا مقابلہ کرنے پر
آمادہ ہے۔ اور جو شخص اس حالت میں ہوتا ہے اُس کے سارے
افعال خواہ وہ الٰہی احکام کے ظاہراً مطابق ہوں یا نہ ہوں وہ گناہ
آلود ہیں۔ دل کی ایسی اندرونی اطاعت کے بغیر فرمانبرداری بھی
نیکوکاری نہیں بلکہ گناہ آلود ریاکاری ہے۔

اب ہم اس امر پر غور کریں کہ از روئے قرآن گناہ کے بارے میں
انسان کی حالت یا درجہ کیا ہے۔ اور یہ سوال کریں کہ کیا از روئے
قرآن آدمی بحیثیت آدمی ہونے کے گناہ آلود ہے؟ میں یہ بیان کر آیا
ہوں کہ از روئے قرآن انسانی ذات اس نتیجے کی طرف لے جاتی ہے کہ
محمد صاحب کی نظروں میں آدم کی افتادگی میں نوع انسان شریک
نہیں۔ جس انسانی ذات کو ہم میراث میں لیتے ہیں وہ گناہ آلود نہیں۔
یہ صرف کمزور ہے اور جلدی سے بدی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نوع
انسان بذاتہ حالت گناہ میں نہیں اور نہ اُس کی ذات میں کوئی ایسی شئے
ہے۔ جو ذات کہ وہ میراث میں لیتا ہے۔ جو بالضرور اُسے خدا کے
فضل سے باز رکھے۔ اُس نے فردوس کو تو کھو دیا لیکن وہ خدا سے

بیگانہ نہیں ہو گیا۔ محمدی علماء نے بہت سی حدیثوں سے اس امر کی
تشریح کی ہے کہ کیوں سارے آدمی گنہگار ہیں۔ کیونکہ اُن کو قرآن
میں کوئی ایسی بات نہ ملی جس میں صریح یہ تعلیم ہو کہ آدمی اپنی پیدائش
اور ذات ہی سے گنہگار ہے۔ پس گناہ ایسی حالت نہیں جس میں
وہ پیدا ہوا۔ روح (نفس) پاک اور راست پیدا ہوتی ہے لیکن
جو بدن اُسے ملا ہے جس میں شہوات و جذبات پائے جاتے ہیں
وہ روح کے اعلیٰ اور پاک ارادوں کو کھینچ کر نیچے لے آتا ہے
وہ کمزور ہے اور آسانی سے گناہ میں گر پڑتا ہے۔ لیکن گناہ میں گرنے
کی قابلیت اور کمزوری از روئے قرآن جرم میں داخل نہیں۔ گناہ کی
طرف رغبت کی تشریح ہم کر چکے ہیں کہ اُس سے محض یہ مراد ہے کہ
گناہ ہمہ جا اور ہمہ اوقات بدی اور نہایت زبردست آزمائش ہے سیلئے
انسان گنہگار ہیں نہ اس لئے کہ وہ گناہ میں پیدا ہوئے ہیں لیکن
اس لئے کہ وہ کمزور پیدا ہوئے ہیں اور فرداً فرداً گر کے وہ گر پڑے اور
مجرم ہو گئے۔ لیکن قرآن میں کسی جگہ گناہ آلود مزاج کا ذکر نہیں آیا۔
خدا کی طرف دل اور روح کے اس رُخ کا نام گناہ ہے نہ نوع انسان کی
طبیعت کا نام۔ باغیانہ خیال تو گناہ نہیں وہ تو صرف گناہ کے لئے آزمائش
ہے۔ انسانی ذات میں کوئی گناہ آلود رغبت نہیں جس کی بیخ کنی درکار
ہو۔ یہ ممکن ہے کہ گناہ آلود عادت ہو۔ لیکن یہ افراد کی عادت ہے نہ
نوع کی۔ اور یہ کسبی عادت ہے نہ طبعی۔

فی الواقع قرآن میں گو اس بات کا ذکر آیا کہ ظاہری اطاعت کے سوا کچھ اور بھی درکار ہے تو بھی یہ خیال پایا جاتا ہے کہ گناہ کا تعلق افعال سے ہے نہ میلان طبع اور مزاج سے۔ اس مضمون کے بارہ میں زیادہ روحانی تعلیم غالباً اس آیت میں مندرج ہے جہاں یوسف کہتا ہے کہ "میں اپنی نسبت نہیں کہتا کہ میں پاک صاف ہوں کیونکہ نفس (انسانی)، تو آدمی کو بدی کے لئے ہمیشہ اُبھارتا ہی رہتا ہے" (سورۂ یوسف ۱۲-۵۳ + نیز دیکھو ۳۳-۵۳)۔ شاید کوئی یہ کہے کہ ان الفاظ سے صرف یہ مراد ہے کہ گناہ ظاہری فعل سے کچھ زیادہ ہے۔ اگر یہ درست بھی ہو تو اس سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ گناہ دل کی حالت یا مزاج کا نام ہے۔ اس آیت میں دلی یا اخلاقی فعل کا ذکر ہے۔ یعنی بدی کی طرف بالرضا آرزو۔ لیکن اس میں یہ تعلیم نہیں کہ گناہ حالت ہے۔ جیسا ہم کہہ آئے۔ گناہ دل کا برتاؤ ہے نہ اُس کی طبیعت۔ اس لئے جب ہم گناہ کے نتیجے اور ثمرے دیکھتے ہیں جیسا کہ قرآن میں اُن کا ذکر ہے۔ تو ہمیں یہ ملتا ہے کہ وُہ محض سزا اور خسارہ ہیں جو اس لئے سرزد نہیں ہوئے کہ گناہ کیا تھا بلکہ اس لئے تاکہ ظاہر کر دے کہ اِس گناہ میں کس شئے کا عدم تھا۔ نہ اس لئے کہ گناہ ایسا گھناؤنا تھا کہ جس سے ایسے دُور تک پہنچنے والے نتیجے نکلے بلکہ اس لئے کہ جہاں گناہ ہے وہاں اطاعت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ عدم اطاعت ہے نہ گناہ کی عملی موجودگی جس کی وجہ سے سزا اور عذاب ملتا ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ آدم کی

توبہ محض اس امر کا افسوس تھا کہ وُہ ایسے فعل کا مرتکب ہوا جس سے اُس کی ذات کو ایسا بڑا نقصان پہنچا۔ اور قرآن کے بہت دیگر مقامات میں یہی تصور پایا جاتا ہے گناہ کے لئے توبہ محض یہ ارادہ ہے کہ میں آئندہ کو بہتر کروں گا اور اُس کے ساتھ اُس نقصان کے لئے افسوس ہے جو گناہ کی وجہ سے اُس کو حاصل ہوا۔ اس میں یہ خیال مطلق نہیں کہ گناہ نے انسان کو خدا سے بیگانہ بنا دیا۔

از روئے قرآن گناہ کے متعلق تعلیم کا بیان ختم کرنے سے پیشتر ایک اور بات کا ذکر کرنا بھی مناسب ہے۔ اور وُہ یہ ہے "گناہ کی قائلیت" یا "گناہ کا احساس"۔ ہم اپنے سے یہ سوال پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آیا محمد صاحب کو گناہ کا حقیقی احساس تھا یا نہیں۔ اور یا اُنہوں نے دوسروں میں ایسا احساس گناہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

یہ نہایت اہم سوال ہے اور قرآن کی تعلیم کا مطالعہ کرتے وقت اس کی ضرور تحقیقات ہونی چاہیئے۔ پھر بھی یہ یاد رکھیں کہ گناہ کے بارہ میں قرآن کی تعلیم کی وقعت کے ساتھ گو اس کا علاقہ ہو لیکن یہ مسئلہ گناہ سے چنداں متعلق نہیں۔ ممکن ہے کہ کسی کو گناہ کے مسئلہ کا ٹھیک اور پورا علم حاصل ہو تو بھی گناہ کا احساس اُسے حاصل نہ ہو اور گناہ سے دل قائل نہ ہو۔ یہ دونوں لازم ملزوم نہیں۔ بلکہ برعکس اس کے یہ ممکن ہے کہ کسی کو گناہ کے مسئلہ کا پورا علم حاصل نہ ہو۔ لیکن گناہ کا بڑا احساس ہو۔ گناہ کی ذات وحقیقت کے بارے میں کسی رائے رکھنے پر گناہ کے

احساس کا انحصار نہیں۔ بلکہ خدا کی قدسیت کے احساس کے آگے دل وضمیر کے کھل جانے سے اس کا علاقہ ہے۔

قرآن کے ورقوں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ محمد صاحب کو گناہ کا کوئی گہرا احساس تھا۔ اُنہیں تعجب ہے کہ آدمی خدا کی مخالفت میں ایسی شرارت اور بیوقوفی کرتے اور قول وفعل سے اُس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تو بھی جب اُنہوں نے فروتنی سے توبہ کرنے اور خدا پر ایمان لانے کی اُن کو دعوت دی تو اُنہوں نے کسی جگہ خستہ وشکستہ دل کی ضرورت ظاہر نہیں کی۔ سارے قرآن میں پیغام یہ ہے کہ توبہ سچے دل سے ہو۔ یہ تو آسان بات ہے۔ لیکن معافی کے لئے چنداں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تو حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ محمد صاحب نے کہیں یہ صاف ذکر نہیں کیا کہ پاک وقدوس خدا کی نظر میں دل کے عجز وزاری کی ضرورت ہے اس لئے جس کا تجربہ اُنہوں نے خود نہیں کیا دوسروں سے بھی وہ یہ طلب نہیں کرتے۔ شاید دل کی شکستگی وعجز کا ذکر کسی قدر اس آیت میں پایا جاتا ہے۔ ”تم سب کا خدا خدائے واحد ہے۔ تو اُسی کے فرماں بردار بنو اور عاجزی کرنے والے بندوں کو خوشخبری سنادو جو ایسے نیک ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جاتا ہے تو اُن کے دل لرز اُٹھتے ہیں“ (سورہ حج ۲۲ - ۳۵ و ۳۶ + نیز دیکھو ۲-۱۹۰) +

ابتدا میں اکثر مسلمان عذاب دوزخ کے ڈر سے زندگی بسر

کرتے تھے۔ احیاء العلوم کی فصل بر شہادت الخوف میں بار بار ذکر ہے کہ کسی نہ کسی وقت بہت مسلمان یہ کہا کرتے تھے کہ کاش خدا ہم کو ہوا کے پرندے یا میدان کے چرند یا بے جان اشیا مخلوق کرتا تاکہ ہم کو خدا کے سامنے جواب دینا نہ پڑتا۔ بعضوں کی نسبت ذکر ہے کہ جب کبھی اُنہوں نے آئندہ جہان اور اُن عذابوں کی حقیقت کو جو قبر کی دُوسری طرف تیار رکھے جاتا تو غش کھا کے گر پڑے۔ اِس جہان کے فانی اور غیر حقیقی ہونے کا احساس اور عاقبت کے حقیقی ہونے کا احساس بعضوں کے دلوں میں ہر وقت موجود تھا۔ اس کے ضمیمہ میں جس مقام کا اقتباس دیا گیا ہے اُس کے لفظی ترجمے سے یہ بخوبی ظاہر ہے۔ یہ تجربہ ابوبکر۔ ابو ذر۔ عثمان۔ عائشہ اور عمر جیسے ایمانداروں کا تھا۔ جو اسلام کے مسلّم پیشوا تھے اور مابعد زمانوں میں جن کی تقلید کی آرزو ایمانداروں کو تھی۔

امام غزالی کی زندگی کے سارے احوال میں کوئی پتہ نہیں ملتا کہ ایسے ایمانداروں کو گناہ کی حقیقی قائلیت یا احساس حاصل تھا۔ اُن کو محض یہ احساس تھا کہ اس نئے مذہب سے دل اور روح کو ولی حقیقی تشفی حاصل نہ ہوئی۔ اُن کو کبھی اس یقین کا احساس نہ تھا کہ اُن کے گناہ بخشے گئے اور اِس لئے وہ دوزخ کے خوفناک عذاب سے بچ گئے۔ مجرموں کو جن خوفناک عذابوں کا ڈر دلایا گیا تھا وہ تو ہمیشہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیکن یہ گناہ کی قائلیت نہ تھی۔

بہرحال قرآن اور اُس کی تعلیم کی نسبت ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس امر کے ماننے کی کوئی معقول وجہ نہیں ملتی کہ خود محمد صاحب کو گناہ کی قائیت کا ایسا احساس تھا یا اُنہوں نے ایمانداروں سے یہ مطالبہ کیا ہو کہ ایسا تجربہ ہونا چاہیئے۔ اُس کی تعلیم تو زیادہ تر یہ ہے کہ گناہ گو خدا کے خلاف سخت قصور ہے۔ تو بھی ایسی شئے نہیں جو انسان کو ایسی حالت میں رکھ دیتا ہے جہاں وُہ نجات کا محتاج ہے۔ خدا انسان کو مخلصی نہیں دیتا۔ وُہ اُس کی توبہ پر محض معاف کر دیتا ہے۔ کیونکہ جب کبھی انسان خدا کی طرف رجوع ہوتا ہے تو خدا اُس کے لئے رحیم و رحمٰن ہے۔ اس معاملے میں محمد صاحب نے نوع انسان کو کچھ ان الفاظ میں پیغام پہنچایا۔ "اے ہمارے بندو جنہوں نے (گناہ کر کے) اپنے اُوپر زیادتیاں کی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے محروم نہ رہو۔ کیونکہ اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ اور وُہ بے شک بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔ (سورۃ الزمر ۳۹-۵۴ + نیز دیکھو ۱۵-۵۵ و ۵۶ + ۴۲-۲۹ + ۴۰-۱۳) +

ضمیمہ

امام غزالی کی تصنیف احیاء العلوم سے چند مفصلہ ذیل اقتباسات دیئے جاتے ہیں (قاہرہ۔ میمونیہ چھاپہ خانہ ۱۳۲۲ھ) جن سے ظاہر ہوگا کہ امام صاحب کا خیال اس امر میں کیا تھا۔

"کسی شیخ نے بشر بن حارث کو خواب میں دیکھا اور کہا کہ ابو نصر التمار اور عبدالوہاب الوراق نے کیا کیا ہے"۔ اور اُس نے کہا "میں نے اس کو اسی ساعت خدا کی حضوری میں چھوڑا ہے کہ وُہ کھا پی رہے ہیں"۔ میں نے کہا "اور آپ" اُس نے جواب دیا کہ خدا جانتا تھا کہ مجھے کھانے پینے کی چنداں اشتہا نہ تھی اس لئے اُس نے مجھے اپنا دیدار بخشا"۔

"علی ابن الموافق کے بارے میں روایت ہے کہ اُس نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں جنت میں داخل ہوا اور میں نے ایک شخص کو دسترخوان کے پاس کھڑے دیکھا اور دو فرشتے اُس کے داہنے اور بائیں ہاتھ کھڑے تھے اور ہر طرح کی نعمتوں کے نوالے اُس کے منہ میں دے رہے تھے اور وُہ کھا رہا تھا۔ اور میں نے ایک شخص کو جنت کے دروازے پر کھڑے دیکھا جو آدمیوں کے چہروں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ کسی کو وُہ اندر جانے دیتا اور کسی کو وُہ نکال دیتا تھا"۔ اُس نے کہا "تب وُہ گھٹ گیا اور پھر میں اُن میں سے دو کے پاس سے گزر کر مقدس چار دیواری میں گیا اور میں نے اوپر العرش میں ایک شخص کو دیکھا جو اپنی نظر پھیر کر خدا کو دیکھ رہا

تھا (خدا اُس کو سرافراز کرے)، اور اُس نے ایک لحظہ کے لئے بھی اپنی آنکھ اُس طرف سے نہ اُٹھائی"۔ اور میں نے رضوان سے کہا "یہ کون ہے"؟ اُس نے جواب دیا "معروف آل کرخی عبداللہ (وہ یہ کر رہا ہے) نہ نار جہنم کے خوف سے۔ نہ خدا کے جنت کے لالچ سے۔ بلکہ خدا کی محبت کے باعث۔ اور خدا نے اُس کو یہ عطا کیا ہے کہ روز قیامت تک اُس کا دیدار حاصل کرتا رہے" (چہارم۔ صفحہ ۲۲۱)

امام غزالی نے (چہارم صفحہ ۲۲۲) یہ گمنام آیت اقتباس کر کے اُس کی یوں تشریح کی ہے۔

"اُس سے غیر حاضر ہونا اُس کی آگ سے بدتر ہے"
اور اُس کی حضوری میں رہنا اُس کے جنت سے بہتر ہے

اِس سے اُس کی اِس سے زیادہ کچھ مراد نہ تھی کہ خدا کے عرفان میں جو خوشی دل کو حاصل ہوتی ہے (خدا اُس کو سرافراز کرے)، وہ کھانے پینے اور مباشرت کی خوشیوں سے بدرجہا اعلیٰ ہے۔ کیونکہ جنت تو حواس خمسہ کے حظ اُٹھانے کی جگہ ہے (یا جسمانی خوشیوں کے حظ اُٹھانے کی جگہ)، لیکن دل کی خوشی صرف خدا کے وصل میں ہے"۔

صفحہ ۲۲۲ پر اُنہوں نے یہ بیان کیا کہ خدا کے عرفان کی خوشی کو (جس کا معراج عاقبت میں دیدار الٰہی ہے)، صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے اس کا تجربہ کیا ہے اور جن کی ذات وصفات ایسی

ہیں کہ اُن کو ایسے عرفان ہی میں حظ حاصل ہوتا ہے"۔ اور اِس لئے جو کوئی اس دنیا میں خدا کو نہیں جانتا وہ اگلے جہان میں اُسے کیسے دیکھے گا"۔ (چہارم۔ صفحہ ۲۲۳) +

"اور جس کسی نے اس دنیا میں خدا کو نہ جانا وہ عاقبت میں کبھی اُس کا دیدار حاصل نہ کرے گا۔ اور جس نے اس دنیا میں اُس کے عرفان کا حظ نہ اُٹھایا وہ دوسرے جہان میں اُس کے دیدار کا حظ نہ اُٹھائے گا ..... لیکن بہترین جنت یہ ہے کہ ہر شخص کو وہ شئے ملے گی جس کی اُس کو آرزو تھی۔ لیکن جسے خدا کے وصل کے سوا کسی دوسری شئے کی آرزو ہی نہ ہو۔ اُسے کسی دوسری شئے سے خوشی حاصل نہ ہوگی"۔ (چہارم صفحہ ۲۲۴) +